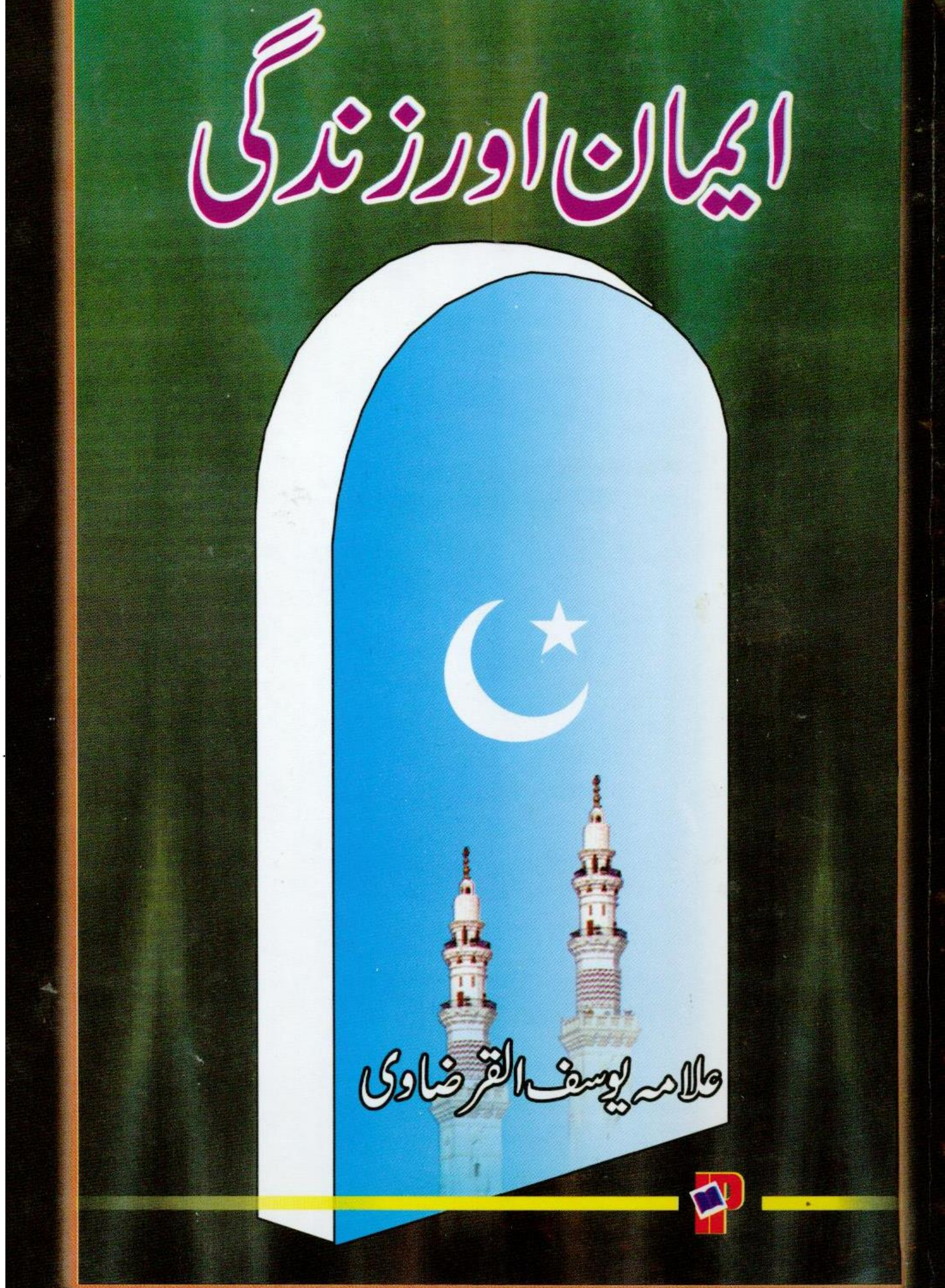
ایمان اور زندگی

مصنف: علامہ یوسف القرضاوی

ترجمہ و تلخیص: عبدالحمید صدیقی

اسلامک پبلی کیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
۳۔کورٹ سٹریٹ، لوئر مال، لاہور (پاکستان)



نام کتاب : ایمان اور زندگی

مصنف : علامہ یوسف القرضاوی

اشاعت : ایڈیشن 2 تعداد 1100

جون 2006ء

اہتمام : پروفیسر محمد امین جاوید (مینجنگ ڈائریکٹر)

اسلامک پبلی کیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ

۳۔کورٹ سٹریٹ، لوئر مال لاہور۔پاکستان

فون : 042-7320961-7248676 فیکس 7214974

ویب سائٹ : www.islamicpak.com.pk

ای میل : Islamicpak@hotmail.com

Islamicpak@yahoo.com

مطبع : میٹرو پرنٹرز، لاہور

قیمت : 100/- روپے

فہرست

عرض ناشر

زیرنظر کتاب علامہ یوسف القرضاوی کی کتاب ''الایمان والحیٰوۃ'' کا اُردو تلخیص و ترجمہ جو مرحوم پروفیسر عبدالحمید صدیقی نے کیا ہے۔ علامہ یوسف القرضاوی کا علمی مقام کسی تعریف کا محتاج نہیں ہے انہوں نے اس کتاب پر انسانی زندگی میں ایمان کی حیثیت ومقام کو واضح کیا ہے اور انفرادی اور اجتماعی زندگی میں ایمان کے گہرے اثرات کا ذکر کیا ہے۔ اس میں ان اوصاف وخصوصیات کے حوالے سے جو انسانی زندگی میں ایمان کے نتیجے میں رونما ہوتی ہیں اور دوسرے ایمان ومذاہب کے مقابلے میں اسلام کے شعور ایمان کی فوقیت واضح کی ہے۔ اسلام ایک ایسا دین اور طریق زندگی ہے جس نے انسانی زندگی کو حرکت اور توانائی بخشی ہے علم وآگہی اس کی امتیازی خصوصیت ہے اور دنیا وآخرت دونوں کو پہلو بہ پہلو اس نے اپنے دامن میں سمیٹا ہے اور اسی بناء پر اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مستقبل ایمان واسلام کا ہے۔ اس کتاب میں ایمان کے بنیادی عناصر اور اسکی امتیازی خصوصیات ایمان اور تکریم انسانی، ایمان اور سعادت وسکنت، ایمان اور طمانیت قلب، ایمان اور الم، ایمان اور محبت، ایمان اور حیات اجتماعی پر موثر انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔

ہمیں توقع ہے کہ اس کتاب کا مطالعہ دین کے فہم اور ایمان کی حقیقت کو جاننے اور سمجھنے میں غیر معمولی مدد دے گا۔

مینجنگ ڈائریکٹر

اسلامک پبلی کیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ لاہور۔

ابتدائیہ

زیرِ نظر کتاب دنیائے عرب کے نامور مصنف علامہ یوسف القرضاوی کی عربی تالیف ''ایمان والحیٰوۃ'' کی تلخیص ہے جس کی متعدد اقساط ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور میں شائع ہو چکی ہیں اور اب، افادۂ عام کی غرض سے انہیں یکجا کر کے کتابی صورت میں شائع کیا جا رہا ہے۔

علامہ موصوف نے اس کتاب میں اور حیات انسانی کے مابین گہرے ربط کو واضح کرتے ہوئے اس کے انفرادی و اجتماعی دوائر پر ایمان کے اثرات بیان کیے ہیں، نیز تفصیل سے بتایا ہے کہ دنیا میں حقیقی سعادت سے ہمکنار ہونے کیلئے دولت ایمان کا حصول از بس ضروری ہے۔

ایمان کیا ہے؟ بعض غیر مرئی اور نامشہود حقائق کا اقرار و تصدیق۔ ایسا اقرار جو انسان کے رگ و پے میں رچ بس جائے کہ اٹھتے بیٹھتے زبان سے اسی کا اظہار ہو اور ایسی تصدیق کہ اس کے متعلق دل میں ریب و تشکک کا کوئی شائبہ بھی باقی نہ رہے۔ یہی تصدیق و اقرار انسان کے افکار و نظریات کا صورت گر ہو، اسی کے سانچے میں اس کے اقوال و اعمال ڈھل جائیں اور زندگی کا معاشرتی و اجتماعی ڈھانچہ بھی سراسر اسی کے مطابق تعمیر ہو۔

اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ وَمَلٰٓئِکَتِہٖ وَ کُتُبِہٖ وَرُسُلِہٖ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْقَدْرِ خَیْرِہٖ وَشَرِّہٖ مِنَ اللّٰہِ تَعَالٰی وَالْبَعْثِ بَعْدَ الْمَوْتِ.

میں اللہ پہ ایمان لایا، اس کے فرشتوں پہ اس کی کتابوں پہ، اس کے رسولوں پہ اور یوم آخرت پہ اور اس بات پہ کہ اچھی اور بری تقدیر کا خالق اللہ ہے اور موت کے بعد اٹھائے جانے پر بھی ایمان لایا

حافظ ابن کثیرؒ نے ایمان کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا:۔

اما الایمان فی اللغة فیطلق علی التصدیق المحض وقد یستعمل فی القران والمراد به ذلک کما قال تعالیٰ یُؤْمِنُ بِاللّٰہِ وَیُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِیْنَ و کما قال اخوة یوسف لابیهم وَمَا اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَلَوْ كُنَّا صَادِقِيْنَ و کذالک

اذا استعمل مقرونا مع الاعمال کقوله تعالیٰ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فاما اذا استعمل مطلقا فالایمان الشرعی المطلوب لایکون الا اعتقادا وقولا و عملا (تفسیر ابن کثیر طبع بدار احیاء الکتب العربیه ۴۰)

لغت میں لفظ ایمان کا اطلاق تصدیق محض پر ہوتا ہے اور قرآن میں اس کا یہ مفہوم مستعمل بھی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ (رسولؐ) اللہ کی تصدیق بھی کرتا ہے اور اہل ایمان کی باتوں کی تصدیق بھی کرتا ہے یا جیسا کہ برادران یوسفؑ نے اپنے باپ سے کہا'' آپ ہماری بات کی تصدیق نہیں کریں گے اگرچہ ہم سچے ہی ہوں'' اسی طرح اگر ایمان اور اعمال صالحہ کا ذکر اکٹھا آئے تو اس وقت بھی لفظ ایمان کا یہی مفہوم مراد ہوتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان (تمام انسان خسارے میں ہیں) سوائے ان لوگوں کے جنہوں نے تصدیق کی اور نیک اعمال کیے اور جب مطلق طور پر لفظ ایمان استعمال ہو تو اس وقت مطلوبہ شرعی ایمان مراد ہوتا ہے۔ جو اعتقاد، قول اور عمل کے مجموعہ کا نام ہے۔

ہوسکتا ہے کہ ایمان کی اس تشریح پر کوئی صاحب اعتراض کریں کہ رسول اللہؐ نے تو فرمایا ہے **من قال لاالہ الا اللہ دخل الجنة** جس نے **لاالہ الا اللہ** کہا وہ جنت میں داخل ہو گیا، پھر آپ محض قول و اعتقاد کے ساتھ عمل کی قید کیوں لگاتے ہیں؟ اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ اگر محض **لاالہ الا اللہ** کہہ دینا ہی انسان کی نجات کیلئے کافی ہوتا تو پھر رسول اللہؐ جیسی رحیم و شفیق ہستی امت کو کبھی تکلیف عمل نہ دیتی۔ اور نہ خود ہی ساری عمر قرآن کے احکام و تعلیمات پر عمل پیرا رہتی، بلکہ سرے سے قرآن ہی مجموعۂ احکام کی شکل میں نازل نہ ہوتا۔ لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ آپؐ نے خود بھی آخر دم تک احکام اسلام پر عمل کیا اور صحابہ کرام کو بھی اسی چیز کی تعلیم دی، لہٰذا آپؐ کے اس فرمان کا مفہوم آپؐ کی زندگی کے مجموعی عمل کی روشنی میں ہی متعین کیا جائے گا۔

اس کا دوسرا جواب یہ ہے کہ ائمہ کرام اور محدثین عظام نے مندرجہ بالا ارشاد رسولؐ کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ جس شخص نے صرف کلمہ ہی پڑھا ہو اور مہلت عمل ملنے سے پیشتر ہی وہ وفات پا گیا تو اسے محض لاالہ الا اللہ کے اقرار کی بنا پر ہی جنت میں داخل کر دیا جائے گا۔

بعض شارحین حدیث نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ اس میں رسول اللہؐ نے یہ نہیں فرمایا کہ کلمۂ توحید کا اقرار کرنے والا جو عمل سے بالکل عاری ہو وہ بغیر کسی سزا کے جنت میں داخل

میں پیدا ہوتے ہیں، فاضل مصنف کو چونکہ جدید وقدیم علوم پر خاصی دستگاہ حاصل ہے۔ اس لئے آپ دوسرے افکار ونظریات اور ادیان و مذاہب کا بھی ساتھ ساتھ جائزہ لیتے گئے ہیں اور جگہ جگہ عقیدہ اسلام (ایمان) کی حقانیت وفوقیت کے اثبات کی بھی کامیاب کوشش کی ہے۔

امید ہے کہ اس کتاب کے مطالعہ سے جدید تعلیم یافتہ نسل کا ضعف اعتقاد بہت حد تک ختم ہو جائیگا اور ایمان کے باب میں اس کا ذہن جن شکوک وشبہات کا شکار ہے ان کا ازالہ بھی کافی حد تک ہو جائے گا یہ سخت ناسپاس گزاری ہوگی۔ اگر میں اس کتاب کی اشاعت کے موقع پر اپنے فاضل دوست جناب منیر احمد صاحب کی غیر معمولی اعانت کا اعتراف نہ کروں جو انہوں نے اس کتاب کی ترتیب وتسوید کے ہر مرحلے پر کی خصوصاً ترجمہ وتلخیص کا کام بتائیدِ ایزدی ختم ہو گیا تو انہوں نے سارے مسودے پر نظر ثانی فرمائی اور اسے پریس کے لئے تیار کیا، اللہ تعالیٰ انہیں اس کی جزائے خیر دے۔ ادارہ معارف اسلامی کے رفقاء اور خاص طور پر اس کے روح رواں جناب پروفیسر خورشید احمد صاحب، اس کے ناظم جناب منور حسین اور جناب شہزاد محمد صاحب کا بھی میں بے حد ممنون ہوں کہ انہوں نے میرے ساتھ ہر مرحلہ پر تعاون فرمایا میں مخدومی مولٰنا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کا بھی خاص طور پر ممنون ہوں جن کی رہنمائی میں یہ کام خداوند تعالیٰ نے پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی توفیق عطا فرمائی۔

*****

مقدمہ

تمام تعریفوں کی سزادار اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، اور درود وسلام کا استحقاق اس کے رسول کو اس کی آل واصحاب اور اس کی ہدایت پر عمل پیرا ہونے والے تمام لوگوں کو ہے۔

اس کے بعد عرض یہ کرنا ہے کہ ایمان کا معاملہ کوئی ضمنی اور ثانوی حیثیت کا حامل نہیں کہ ہم اس سے بے اعتنائی برت سکیں یا اسے فراموش کر دیں۔ آخر یہ کیسے ہو سکتا ہے جبکہ ایمان کا انسان کی ذات اور اس کے انجام سے نہایت گہرا تعلق ہوتا ہے بلکہ انسان کا سب سے اہم مسئلہ ہی ایمان کا ہے، اس کا وجود ابدی سعادت کا ضامن ہے تو اس کا عدم دائمی شقاوت کو مستلزم ہے اس کی بدولت آدمی جنت کا مستحق ٹھہرتا ہے اور اس کے بغیر نار جہنم کا ایندھن بنتا ہے۔ لہٰذا مسئلہ ایمان کی حقیقت تقاضا کرتی ہے کہ ہر ذی عقل وشعور اس کے بارے میں فکر مند رہے اور اس کی حقیقت تک رسائی حاصل کرے جیسا کہ معلوم ہے بہت سے دانشمندوں نے اس مسئلہ کو موضوع فکر بنایا ہے اور اپنے مخصوص طریقۂ استدلال سے ایمان باللہ کا اثبات کیا ہے۔ ان میں سے بعض نے تو اپنے دل کی گہرائیوں سے بلند ہونے والی آواز پر کان دھرا ہے کہ فاطر السمٰوات والارض کی ذات میں کوئی شک نہیں کیا جا سکتا[1] کہ یہ ایک ایسی پکار ہے جو انسان کی فطرت میں ودیعت کی گئی ہے اور بعض اس طرف گئے ہیں کہ ہر صنعت کا کوئی نہ کوئی صانع ہوتا ہے، ہر حرکت کے پیچھے کوئی محرک کارفرما ہوتا ہے اور کوئی نظام بھی کسی ناظم کے بغیر نہیں چل سکتا تو اس اصول کے مطابق اس کارخانہ قدرت کا حیرت انگیز نظام بھی ایک زبردست محرک اور علیم وخبیر ناظم کا متقاضی ہے بعض دانشوروں نے بالکل حسابی نقطۂ نگاہ اختیار کیا ہے جن کی بہترین ترجمانی ابوالعلا معری کے یہ شعر کرتے ہیں:

قال المنجم والطبیب کلاھما — ان صح قولکما فلست بخاسر

لاتبعث الاموات قُلت الیکما — اوصح قولی فالخسار علیکما

[1] افی اللہ شک فاطر السموات والارض

ہو جائے گا بلکہ اس سے آپ کی مراد یہ ہے کہ عمل نہ کرنے کی سزا بھگتنے کے بعد بالآخر اس کلمہ کی بدولت وہ جنت میں داخل ہو جائے گا، دخولِ اوّل کی سعادت اُسے حاصل نہ ہو سکے گی۔

گزارش کرنے کا منشا یہ ہے کہ اس حقیقت کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ ایمان محض قول اور اعتقاد ہی کا نام نہیں بلکہ کو بھی عمل ہے۔

صحیحین کی ایک روایت میں خود رسول اللہؐ نے ایمان کے مستلزم عمل ہونے کی طرف واضح اشارہ فرمایا ہے۔

عن ابی هريرةؓ قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم الايمان بضع وسبعون شعبة فافضلها قول لااله الّا الله و ادنا ها اماطة الاذى عن الطريق والحياء شعبة من الايمان (متفق عليه)

حضرت ابو ہریرہؓ نے روایت کرتے ہوئے کہا کہ رسول اللہؐ نے فرمایا۔ کہ ایمان کی ستر ۷۰ سے کچھ اوپر شاخیں ہیں، ان میں سب سے افضل لا الٰہ الّا اللہ کا اقرار ہے اور سب سے ادنیٰ راستہ سے اذیت رساں چیز کی ہٹانا ہے، نیز فرمایا کہ حیاء بھی ایمان ہی کی ایک شاخ ہے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس حدیث پاک کی تشریح کرتے ہوئے حافظ ابوبکرؒ احمد بن الحسین البیہقی نے اپنی مشہور تالیف شعب الایمان میں جن امور کے اقرار تصدیق اور اتباع و عمل کو دائرہ ایمان میں شامل کیا ہے، ان کا یہاں ذکر کر دیا جائے، امام موصوف نے ایمان کے ستر سے کچھ اوپر شعبوں کی تفصیل اس طرح بیان کی ہے......ہم یہاں امام کے بیان کردہ دلائل کا ذکر نہیں کریں گے صرف شعب الایمان کے عنوانات دینے پر اکتفا کر رہے ہیں۔

۱۔ لا الٰہ الّا اللہ کا اقرار، ۲۔ انبیاء و رسل کی تصدیق، ۳۔ ملائکہ کو ماننا، ۴۔ قرآن اور دیگر کتب الٰہی کو ماننا، ۵۔ تقدیر کے خیر و شر کو من جانب اللہ سمجھنا، ۶۔ یوم آخرت کا یقین، ۷۔ بعث بعد الموت کا اقرار، ۸۔ قبروں سے اٹھائے جانے کے بعد بنی نوع انسان کا حشر، ۹۔ جنت کا دار المومنین ہونا اور جہنم کا دار الکافرین ہونا، ۱۰۔ وجوب محبت الٰہی، ۱۱۔ وجوب خشیتِ الٰہی، ۱۲۔ وجوب محبت نبیؐ، ۱۵۔ وجوب توقیر و تعظیم نبیؐ، ۱۶۔ دین کو ہر چیز سے زیادہ عزیز رکھنا، ۱۷۔ تحصیل علم دین، ۱۸۔ تبلیغ و نشر علم دین، ۱۹۔ تعظیم قرآن مجید، ۲۰۔ وجوب

طہارت و پاکیزگی، ۲۱۔ پانچ نمازوں کی فرضیت، ۲۲۔ وجوب ایتاء زکوٰۃ، ۲۳۔ وجوب صوم رمضان، ۲۴۔ اعتکاف، ۲۵۔ فرضیت حج، ۲۶۔ جہاد فی سبیل اللہ، ۲۷۔ مملکت اسلامیہ کی سرحدات کی حفاظت و پاسبانی، ۲۸۔ لشکر اعدا کے سامنے ثابت قدمی، ۲۹۔ مال غنیمت میں سے خمس حاکم وقت کو ادا کرنا، ۳۰۔ غلام آزاد کرنا، ۳۱۔ کفارات کی ادائیگی۔ ۳۲۔ عہد و پیمان کو پورا کرنا، ۳۳۔ اللہ تعالیٰ کا شکر کرنا، ۳۴۔ غیر ضروری اور بے ہودہ قیل و قال سے زبان کی حفاظت کرنا، ۳۵۔ امانت ادا کرنا، ۳۶۔ تحریم قتل النفوس، ۳۷۔ شرمگاہوں کی حرمت و حفاظت، ۳۸۔ ناجائز طور پر لوگوں کے اموال حاصل کرنے سے ہاتھ کھینچنا، ۳۹۔ اکل حلال ۴۰۔ ملابسِ حریر (مردوں کیلئے) اور زرین و سیمیں ظروف کی تحریم، ۴۱۔ مخالف شریعت لہو و لعب کی تحریم، ۴۲۔ نان و نفقہ میں میانہ روی، ۴۳۔ ترک کینہ و حسد، ۴۴۔ عزت و آبرو کی حرمت، ۴۵۔ اللہ کیلئے اخلاص عمل اور ترک ریا، ۴۶۔ نیکی کر کے خوش ہونا اور برائی سے غمگین ہو جانا، ۴۷۔ گناہوں سے توبہ کرنا، ۴۸۔ عید اضحیٰ کے موقع پر یا عقیقہ و صدقہ کی غرض سے قربانی دینا، ۴۹۔ اولی الامر کی اطاعت کرنا، ۵۰۔ جماعتی زندگی اختیار کرنا، ۵۱۔ لوگوں کے درمیان عدل و انصاف سے فیصلہ کرنا، ۵۲ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر، ۵۳۔ نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں تعاون، ۵۴۔ والدین کے ساتھ حسن سلوک، ۵۶۔ صلۂ رحمی) اعزہ و اقربا سے میل ملاپ) ۵۷۔ حسن اخلاق، ۵۸۔ آقا کا غلام سے حسن سلوک، ۵۹۔ غلام کا آقا سے حسن سلوک، ۶۰۔ اولاد کے حقوق ادا کرنا۔ ۶۱۔ اپنے دینی بھائیوں سے مقاربت و مودت۔ ۶۲۔ سلام کا جواب دینا، ۶۳۔ مریض کی عیادت کرنا، ۶۴۔ مسلمان کی نماز جنازہ پڑھنا، ۶۵۔ چھینک کا جواب دینا، ۶۶۔ کفار و مفسدین سے دور رہنا، ۶۷۔ ہمسایہ کی عزت و توقیر کرنا، ۶۸۔ گنہ گاروں کے گناہوں کی پردہ پوشی، ۷۰۔ مصائب و آلام پر صبر، ۷۱۔ زہد و قصر الامل، ۷۲۔ غیرت، ۷۳۔ لغو امور سے اعراض، ۷۴۔ جود و سخا، ۷۵۔ چھوٹے پر رحم اور بڑے کی عزت، ۷۶۔ اصلاح ذات البین، ۷۷۔ اپنے مسلم بھائی کیلئے بھی وہی چیز پسند کرنا جو اپنے لئے پسند کی جائے۔

''ایمان والحیوٰۃ'' میں زیادہ تر ان اوصاف کی نشاندہی کی گئی ہے جو ایمان کے زیر اثر انسان

(ترجمہ) ستارہ شناس اور طبیب دونوں کا کہنا ہے کہ مُردوں کو زندہ نہیں کیا جائے گا مگر میں کہتا ہوں کہ تمہارا قول تمہیں کو مبارک کیونکہ اگر تمہاری بات صحیح نکلی تو مجھے کوئی خسارہ نہیں ہوگا (اور میں بھی دوسرے انسانوں کی طرح مرکر مٹی میں مل جاؤں گا) لیکن اگر میرا قول درست ثابت ہوا تو ہر خسارے میں تم رہو گے۔ (جنہوں نے دوسرے جہان کیلئے کوئی تیاری نہ کی ہوگی)

مگر عقیدہ اسلام کے اثبات کے سلسلہ میں اس موخر الذکر موقف پر ہم اتنا اضافہ اور کریں گے کہ بات صرف اتنی ہی نہیں کہ اللہ اور یوم آخرت پہ ایمان کے نتیجہ میں انسان کی آخرت ہی بنتی ہے اور حیات دنیا اس سے بالکل مستفید و مُستنیر نہیں ہوتی۔ نہیں بلکہ دنیا اور آخرت دونوں کو اس کا نفع پہنچتا ہے۔

لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْ فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ.

اس لئے کہ دین میں جو عبادات انسان پر فرض کی گئی ہیں وہ روح کی بالیدگی اور تزکیۂ نفس کیلئے ہیں۔ جن امور کو حرام قرار دیا گیا ہے ان کے مضر اثرات سے درحقیقت اس کی عقل، اخلاق، جان و مال اور عزت و آبرو کو بچانا مقصود ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں نبی امیؐ کی دینی تعلیمات کا ذکر بدین الفاظ کیا گیا ہے "وہ انہیں نیکی کا حکم دیتا ہے برائی سے روکتا ہے ان کیلئے پاک چیزیں حلال اور ناپاک چیزیں حرام کرتا ہے اور ان پر سے وہ بوجھ اتارتا ہے جو ان پر لدے ہوئے تھے۔ اور وہ بندھن کھولتا ہے جن میں وہ جکڑے ہوئے تھے" (الاعراف: ۱۵۷) علاوہ ازیں دین انسانوں کو اگر کسی چیز سے محروم کرتا ہے تو اس کا ایسا بہترین بدل بھی دیتا ہے، جو مفاسد سے بالکل پاک ہوتا ہے۔

پس ان تصریحات سے ثابت ہوگیا کہ ایماندار اللہ تعالیٰ کی عبادت کر کے اور اس کی حرام کردہ چیزوں سے اجتناب کر کے کسی خسارے میں نہیں رہتا، بلکہ اس کے نتیجے میں رشد و ہدایت، حق و صداقت پر استقامت، اعمال خیر و صلاح پر ثبات و دوام، اور اپنی خواہشات پر مکمل ضبط حاصل کر لیتا ہے۔ طمانیت اور سکون زیست اس پر مستزاد ہیں۔

بدقسمتی سے ہمارے زمانے میں لوگوں کا یہ حال ہے کہ مادی منفعت کی تحصیل کیلئے مارے مارے پھرتے ہیں اور ان میں سے بہت سے اس خیال اور رائے کے حامل ہیں کہ وہی چیز حق ہے

جو نفع بخش ہو نہ کہ وہ جو واقعہ کے مطابق ہو یا جو دلائل و براہین کی رو سے صحیح ہو اس مسلک کے علمبردار یہ کہتے ہیں کہ مقیاس حقیقت صرف منفعت ہے اور سب سے اہم چیز کسی کام کے وہ نتائج ہیں جو اس دنیا میں ظہور پذیر ہوں نیز یہ کہ صداقت حقیقت کا نام نہیں بلکہ جو کچھ موجود ہے اسے تسلیم کر لینے کا نام ہے۔ ان کے نزدیک اگر دینوی مساعی کے نتائج اپنی اغراض اور مفادات کے مطابق ظاہر ہو رہے ہوں تو وہ خیر بھی ہیں، صداقت بھی اور حق بھی لیکن اگر معاملہ اس کے برعکس ہو تو وہ شر، کذب اور باطل ہے۔

اس مسلک کی ہم پوری طرح تائید نہیں کرتے تاہم اس معیار پر اپنے عقیدہ وایمان کو پرکھتے ہوئے ہمیں کوئی خطرہ بھی محسوس نہیں ہوتا کیونکہ ہم اس امر پر یقین رکھتے ہیں کہ انسانوں کیلئے سب سے زیادہ نفع بخش چیز حق ہے اور سب سے زیادہ نقصان دہ چیز باطل اور یہ ہمارا ہی نہیں خود قرآن کا فیصلہ ہے۔ قرآن نے حق کو آب رواں اور معدن نافع سے تعبیر کیا ہے جبکہ باطل کو سطح آب پر پھیلا ہوا جھاگ، یا بھٹی میں زر خالص کے اوپر آنے والی میل کچیل قرار دیا ہے۔

اَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ فَسَالَتْ اَوْدِيَةٌ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا ط وَمِمَّا يُوْقِدُوْنَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَاءَ حِلْيَةٍ اَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهٗ ط كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ ۵ ط فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً ج وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ ۝ (الرعد: ۱۷)

اس آیت پاک میں اللہ تعالیٰ نے صریحاً کیلئے "مَا يَنْفَعُ النَّاسَ" کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں جن کا صاف مطلب یہ ہے کہ حق ہی انسانوں کیلئے جسمانی، عقلی، اور قلبی طور پر نفع بخش ہے اور یہی ان کی انفرادی و اجتماعی زندگی اور ان کیلئے دنیا و آخرت میں نافع ہے۔

حق و صداقت کے بارے میں اس حد تک تو ہم مادہ پرستوں کے اصول افادیت سے اتفاق کرتے ہیں، لیکن خود افادیت کے تعین اور اس کے مفہوم کی تحدید میں جو کچھ انہوں نے کہا ہے اس سے بلاشبہ ہمیں اختلاف ہے، ہمارے نزدیک افادیت مادی اشیاء کی کسی مقررہ مقدار کا نام نہیں نہ محض ایک فرد کے مفاد کو منفعت کہا جا سکتا ہے بلکہ ہمارے مفہوم افادیت میں مقدار، کیفیت، مادہ، روح، فرد اور معاشرہ سب شامل ہیں مزید برآں ہم افادیت کا دائرہ، حیات

دنیا تک ہی محدود نہیں سمجھتے بلکہ اس میں اتنی وسعت اور گنجائش دیکھتے ہیں جو آخرت کی غیر فانی زندگی کا بھی احاطہ کر لے۔

اس کتاب کی تالیف سے ہمارے پیش نظر بعض ان مقدس اثرات پر روشنی ڈالنا ہے جو حیات انسانی پہ دین کی بدولت مرتب ہوتے ہیں خصوصاً دین کی ان تعلیمات کی بدولت جو ایمان باللہؑ ایمان بالرسالت، اور ایمان بالیوم الآخرۃ اور اس کے حساب کتاب جزاء وثواب اور سزا وعقاب سے متعلق ہیں نیز اس شرانگیز نظریہ کا ابطال کرنا چاہتے ہیں جو دین کو شعب واقوام کیلئے افیون بتاتا ہے اور دُنیوی ترقی کیلئے ایک بہت بڑی رکاوٹ، جیسا کہ اشتراکیوں کا دعویٰ ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر دُنیوی فلاح و بہبود کے پیمانہ ہی سے دین کو ناپ کر دیکھا جائے تو بھی اس کا پلڑا دوسری ہر مفید چیز پر بھاری رہتا ہے۔ تاریخ کے اوراق اس حقیقت کے شاہد ہیں کہ دین انسان کی بنیادی ضرورت ہے۔ یہ فرد کیلئے ناگزیر ہے تاکہ وہ اطمینان قلب حاصل کر سکے۔ سعادت مند بن سکے اور اپنے نفس کا تزکیہ کر سکے اور معاشرہ کیلئے بھی ضروری ہے تاکہ اس میں ٹھہراؤ اور استحکام پیدا ہو، اور رفعت وارتقار سے ہمکنار ہو۔

فرد دین وایمان کے بغیر ایک تنکا ہے جسے تندوتیز ہوا اڑائے لئے پھرتی ہے جسے کسی پل قرار نصیب نہ ہو اور جس کی کوئی منزل متعین نہ ہو دین وایمان کے بغیر انسان ودپائے کا ایک حیوان ہے جس کی کوئی قدر و قیمت نہیں جو حیران و پریشان زندگی بسر کرتا ہے۔ نہ اپنے مقصد وجود سے آگاہ ہو نہ اپنی ذات کی حقیقت سے واقف اور نہ اس کائنات کے خالق و مالک ہی سے آشنا، وہ نہیں جانتا کہ اسے لباس ہستی کیوں پہنایا گیا ہے اور ایک مدت معینہ کے بعد وہ اس سے کیوں محروم کر دیا جاتا ہے؟ دین وایمان کے بغیر وہ ایک حریص جانور یا خونخوار درندہ ثابت ہوتا ہے جسے کوئی تہذیب اور قانون بھی حرص اور درندگی سے باز نہیں رکھ سکتا۔ معاشرہ بھی دین وایمان کے بغیر جنگل کا معاشرہ بن جاتا ہے اگرچہ اس میں تہذیب وثقافت کی چمک دمک پائی جاتی ہے پھر بھی زندگی کا حق زبردست اور طاقتور ہی کو ملتا ہے۔ افضل واتقیٰ کے حفظ وبقا کی کوئی صورت نظر نہیں آتی وہ معاشرہ ہلاکت وبربادی اور شقاوت وبدبختی سے دو چار رہتا ہے اگرچہ اس میں تنعم ورفاہیت کے اسباب فراواں ہوں۔ وہ نہایت گھٹیا اور ذلیل معاشرہ ہوتا ہے کیونکہ اس میں

انسانوں کی خواہشات کا دائرہ حسی لذائذ کے حصول تک ہی محدود ہوتا ہے۔

دین وایمان کے نور سے محروم علم بھی اگرچہ بڑا پھیلاؤ رکھتا ہے اور وسیع دوائر حیات کو متاثر کرتا ہے، تاہم اس کے بس میں نہیں کہ انسانوں کو سکون وسعادت سے ہمکنار کر سکے اس نے بلاشبہ حیات انسانی کے مادی پہلو میں کچھ ترقی کی ہے اور زمان ومکاں کی پہنائیوں کو سمیٹ کر رکھ دیا ہے اور اس لحاظ سے ہم اسے ''برق رفتار دور'' کا نام دے سکتے ہیں لیکن کیا علم کی مادی ترقی کے اس دور کو دور فضیلت وطمانیت اور عہد سعادت سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے؟ نہیں یقیناً نہیں اس علم نے دور جدید کے انسان کو نت نئے وسائل حیات فراہم کئے ہیں۔ مگر اسے منزل کا شعور نہیں بخشا، اور وہ انسان کتنا بدنصیب ہے جو اسباب ووسائل ہی میں منہمک رہے اور اپنی منزل کو فراموش کر دے جو معمولی رقبہ زمین کے اندر کھو جائے، اور وسیع وعریض میدان کو نظرانداز کر دے اور چھلکے ہی کو سب کچھ سمجھ لے اور مغز سے بے خبر ہو جائے، بجا کہ اس علم نے انسان کے ظاہر کو سنوارا ہے مگر باطن کی گہرائیوں سے اسے روشناس نہیں کیا۔ تسلیم ہے کہ مادی علم نے اس کو بہت کچھ دیا لیکن بلند مرتبہ ومقام اور کسی ارفع واعلیٰ نصب العین کی نشاندہی نہیں کی جس کے حصول کیلئے وہ زندہ رہ سکے اور وقت آنے پر جان کی بازی لگا دے ظاہر ہے کہ یہ کام مادی علم نہیں کر سکتا یہ تو ایمان ہی کا وظیفہ ہے اور وہی اس سے بحسن وخوبی عہدہ برآ ہو سکتا ہے۔

بہت سے فلاسفہ ومفکرین ہمیں ایسے نظر آتے ہیں جو اللہ تعالیٰ پر ایمان تو نہیں رکھتے لیکن اللہ پر ایمان لانے کو صحیح سمجھتے ہیں وہ ان پاکیزہ وخوشگوار اثرات کا انکار نہیں کر سکے جو ایمان باللہ کی بدولت فرد اور معاشرہ پر مرتب ہوتے ہیں۔ ایک فلسفی کا قول ہے کہ اگر اللہ موجود نہ ہوتا تو ہم پر واجب تھا کہ اسے ایجاد کر لیں اور پھر اس پر ایمان لائیں اس کی رضا کے طلب گار ہوں اور اس کے محاسبہ ومواخذہ سے خائف یہاں تک کہ شریر لوگ شرارت سے باز آ جائیں اور عامتہ الناس کے اخلاق سنور جائیں، ایک دوسرے مفکر کا قول ہے ''تم اللہ کے بارے میں شک کا اظہار کیوں کرتے ہو؟ اگر اللہ (کا خوف) نہ ہوتا تو میری بیوی میری خیانت کرتی اور میرا خادم میرا مال اڑا لے جاتا۔''

ہم اس طرز استدلال سے اتفاق نہیں کر سکتے کیونکہ ہمارے نزدیک حق اس قابل ہے کہ اس کا اتباع کیا جائے چاہے نتیجہ کچھ ہی کیوں نہ ہوا اور اباطیل وخرافات کو بھی نتائج سے صرف نظر کرتے ہوئے رد کر دینا واجب ہے۔ بایں ہمہ ان اقوال سے اعتنا کرنے کی وجہ یہ ہے کہ منصف مزاج دشمنان ایمان اور اعدائے دین میں بھی اتنی جرات نہیں کہ حیات انسانی پہ ایمان کے اثرات کا انکار کر سکیں، پس جب حق کو بذاتہ قبول کرنا واجب ہے، اگر چہ وہ نفع بخش نہ ہو اور کسی ضرر کو بھی دفع نہ کرتا ہو تو اس حق کو قبول کر لینا تو بدرجہ اولیٰ واجب ہے، جس کا نفع دوسری ہر چیز سے بڑھا ہوا ہو، لہٰذا وجود باری تعالیٰ، اس کا تنہا کائنات پر حکومت کرنا، تدبیر امر فرمانا اور مستحق عبادات ہونا اس کا انبیاء کو معبوث کرنا، اور حیات اخروی سے متعلق انبیاء کے بیانات کی صداقت...... ان میں سے ہر چیز حق ہے اور پوری طرح مدلل اور واضح ان کا محض حق ہونا ہی ان پر ایمان لانے کو مستلزم تھا مگر یہاں تو اس کے ساتھ انسان کے ظاہر و باطن کی درستی، فرد و معاشرہ کی ترقی اور دنیا وآخرت کی سعادت بھی وابستہ ہے۔

ایمان کے اثرات:

جب ہم ایمان کے اثرات کا ذکر کرتے ہیں تو اس سے ہماری مراد نہایت قوی اور توانا ایمان ہوتا ہے جو ہر لحاظ سے حیات آفریں ہوتا ہے، جو قلوب واذہان پر ضوبار ہو اور جو دل کی گہرائیوں میں اپنی راہ آپ پیدا کرتا چلا جائے، ایمان سے ہماری مراد ضعیف ایمان نہیں جس پر اضمحلال طاری ہو جو غیر متحرک اور بے جان ہو، ہم تو زندہ و بیدار ایمان کی بات کرتے ہیں چاہے ایسے ایمان کے حامل چند ہی لوگ کیوں نہ ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جن مادہ پرستوں سے ہمارا یہاں مقابلہ ہے اور جو ایمان کی قدر و قیمت اور حقیقت کے بارے میں مبتلائے شکوک وشبہات ہیں وہ جان سکیں کہ ایمان کی جس طاقت سے وہ نبرد آزما ہیں اس کے پاکیزہ اور مقدس اثرات کو لوگوں کے قلوب واذہان پر نہایت گہرا تسلط حاصل ہے۔

مشہور یہودی مفکر کارل مارکس نے جو یہ کہا کہ مذہب زندگی کا دشمن اور اقوام وملل کے لئے افیون کی حیثیت رکھتا ہے تو شاید اس نے دوسرے ادیان ومذاہب اور ان کے پیروؤں کی سیرتوں کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات کہی ہو کیونکہ اسلام کے علاوہ دوسرے ادیان ومذاہب میں بہت

کچھ آمیزش ہو چکی ہے اور خواہش نفس کی پیروی کرنے والے لوگوں نے ان کی سیدھی اور صاف تعلیمات کو مکدر کر ڈالا ہے۔ کارل مارکس کے بعد اس کے اندھے مقلدین نے بھی بغیر کسی تحقیق کے طوطوں کی طرح وہی رٹ لگانی شروع کر دی اور اس خیال ورائے کا اطلاق ہر دین ومذہب پر کرنے لگے حالانکہ ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ دین اسلام مذہب کلیسا سے اور اسلامی معاشرہ یورپی معاشرہ سے بہت کچھ مختلف ہے۔

دین اسلام تو ایک ایسا دین ہے جس نے حیات انسان کو حرکت اور توانائی بخشی ہے جس سے روح و مادہ دونوں فیضیاب ہیں جو صداقت اور قوت کا علمبردار ہے علم وآگہی جس کی امتیازی خصوصیت ہے اور دنیا وآخرت یکساں طور پر جس کی کمند فکر کے اسیر ہیں۔ رب کائنات کی یکتائی کا قائل یہ وہ عقیدہ ہے جو نفس انسانی میں مجد وکرامت آزادی وحریت کے بیج بوتا ہے اور اللہ واحد وقہار کے علاوہ کسی اور کے سامنے اظہار عجز کو کفر وفسق اور ظلم قرار دیتا ہے اور شدت سے اس بات کا انکار کرتا ہے کہ انسان انسانوں کے خدا بن بیٹھیں۔

دین وایمان کے یہ اثرات دنیا کے ہر حصے میں دیکھے جا سکتے ہیں مگر ہمارے اسلامی وعربی ممالک میں تو خاص طور پر ان کی جڑیں بہت گہری اور ان کی ضرورت بہت زیادہ محسوس ہوتی ہے اصل بات یہ ہے کہ جس طرح ہر قفل کو کھولنے کیلئے ایک معین کلید درکار ہے اور اس کے بغیر چاہے کتنی ہی کوشش کی جائے قفل کو کھولنے میں کامیابی نصیب نہیں ہوتی، بالکل اسی طرح اسلامی وعربی قوم کا تشخص اگر صحیح طور پر نمایاں اور اس کے جوہر پوری طرح کھل سکتے ہیں تو یہ صرف دین وایمان اور عقیدۂ اسلام ہی کی بدولت ممکن ہے اس شاہ کلید کو نظر انداز کر کے عربی قوم کے تشخص اجاگر کرنے کی جتنی کوششیں بھی کی جائیں گی سب رائیگاں اور عبث ثابت ہوں گی جیسے پانی پر عمارت کی بنیاد رکھنا یا ہوا میں کچھ تحریر کرنا عبث ہے۔

یہ ایمان ہی تھا جس نے عربوں کو ریگزار عرب سے اٹھایا تا کہ وہ دنیا کو کفر وجہالت کے اندھیروں سے نکال کر علم ویقین کی روشنی میں لے آئیں۔ ایمان کی بدولت وہ اس قابل ہوئے کہ اکاسرۂ ایران قیاصرۂ روم اور ہر جابر ومستبد اور متکبر حکمران کو ادب سکھا سکیں اس کے عقیدۂ توحید سے سرشار ہو کر وہ اٹھے اور مخلوق خدا کو انسانوں کی بندگی سے نکال کر خالق کی بندگی کا خوگر

بنایا۔ دنیا کی تنگی و تلخی سے ان کا رخ دنیا و آخرت کی کشائش وسعت کی طرف پھیر دیا اور ادیان و مذاہب کے ظلم و جور سے بچا کر انہیں اسلام کے انصاف سے ہمکنار کر دیا۔

ایمان ہی کی بدولت ہماری عربی قوم کو اقوام یورپ پہ بالا دستی نصیب ہوئی ورنہ وہ تو صلیبی جنگوں میں ساری کی ساری مشرق وسطیٰ پہ دوڑ آئی تھیں تا کہ یہاں کی ہر چیز کو تہس نہس کر ڈالیں ایمان ہی کی وجہ سے تاتاری حملہ آوروں کے مقابلے میں مسلمان فتح مند و ظفریاب ہوئے مگر آج وہی عربی قوم ہے کہ جس کے سینے پر دشمن دندنا رہا ہے جو اس کے وجود کیلئے ایک مستقل خطرہ بنا ہوا ہے اور اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دینے کے مذموم عزائم رکھتا ہے اگرچہ دشمن...... اسرائیل...... کو مشرق مغرب کی تمام طاغوتی طاقتوں کا تعاون حاصل ہے۔ اس دشمن کا مقابلہ کرنے کیلئے ہمارے پاس کوئی ہتھیار دین و ایمان سے زیادہ موثر اور پائیدار نہیں۔ اس میں کچھ شبہ نہیں کہ مادی طاقت اور حربی ساز و سامان کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ مگر یہ ساز و سامان کسی مرد مجاہد اور شجاع و دلیر آدمی ہی کے ہاتھ میں ہو تو مفید رہتا ہے اور یہ معلوم ہے کہ شجاعت کا جوہر آدمی کے اندر ایمان ہی پیدا کرتا ہے۔

ادھر ہم میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو مغرب کے جدید مادی نظریات سے متاثر ہیں ایسے نظریات کو جو حیات دنیا میں خدا اور آخرت کو کوئی مقام اور اہمیت نہیں دیتے۔ مگر بوقت ضرورت دین کو بطور آلہ کار استعمال کر لیتے ہیں کہ جب ضرورت پڑی اور وقتی اغراض داعی ہوئیں تو دین کا نام لے کر دین دار عوام کے اندر جذبہ و جوش پیدا کر لیا اور انہیں خوش بھی کر دیا۔

یہی وجہ ہے کہ دین و ایمان کو امت کی قیادت و تربیت کے منصب سے الگ کر دیا گیا ہے اور تعلیم و ثقافت اور زندگی کے دیگر فکری اور عملی اور سیاسی و اجتماعی دوائر میں بھی اسے اپنا فرض ادا کرنے کے قابل نہیں رہنے دیا ہے بس کچھ رسوم و مظاہر ہیں جن کو دین کے نام پر اختیار کر لیا گیا ہے اور جن کی افادیت محسوس نہیں ہوتی۔

1967ء میں جب ہمارے اسرائیل کے درمیان حرب و قتال برپا ہوا تو اس وقت ہمارے پاس بہت سا اسلحہ تھا مگر ایمان نہایت قلیل نتیجۃً اسلحہ کی کثرت ہمارے کچھ بھی کام نہ آئی اور ٹینک طیارے اور جہازوں کے بیڑے یکسر بے کار ثابت ہوئے آخر نرا اسلحہ کیا کر سکتا تھا۔ جب تک اسے استعمال کرنے والے جوان دولت ایمان سے مالا مال نہ ہوتے۔ متنبی نے کیا خوب کہا ہے۔

وما تنفع الخيل الكرام وَلا القنا اذالهم يكن فوق الكرام كرام!

ترجمہ: عمدہ گھوڑے اور تیر و سنان مفید ثابت نہیں ہوتے اگر ان پر سوار جنگجو، شجاع اور غیور نہ ہوں۔

اور یہ حقیقت بجائے خود کتنی ہی سنگین اور تلخ کیوں نہ ہو ہمارے اندر اتنی جرات ہونی چاہیے کہ اس کا برملا اعتراف کریں اور آئندہ کیلئے مشرق وسطیٰ کی گزشتہ جنگ سے سبق حاصل کریں اور اپنی زندگی کی تعمیر ایمان اور اس کے مقتضیات کی بنیاد پر کریں جب تک ہم اپنے آپ کو نہیں بدلتے اللہ تعالیٰ بھی ہمارے حالات کو نہیں بدلے گے۔ اور ہم بدنصیبی کے تھپیڑے ہی کھاتے رہیں گے۔

ہمارا دشمن...... اسرائیل...... جب دینی اساس پر اپنے فرزندوں کی تربیت کرتا ہے اور ایسی معرکہ آرائیوں کے انہیں خواب دکھاتا ہے جو اسرائیل کی مجد و بزرگی اور ملک سلیمانؑ کے دوبارہ قیام کی راہ ہموار کر سکیں تو ایسی صورت میں ہم ہی ایمان کے تابناک اثرات کا انکار کیوں کریں۔ کیوں اہل ایمان کو ایمان سے باز رکھنے اور غلط نظریات اختیار کرنے پر مجبور کریں اور کیوں انہیں ایسے نعرے دیں کہ غلبہ کشمکش کے نتیجہ میں حاصل ہوتا ہے یا غلبہ جمہور کا حق ہے حالانکہ ہماری قوم صرف یہ جانتی ہے کہ فتح و نصرت اہل ایمان کا مقدر ہے اور بہتر انجام تقویٰ شعار لوگوں کیلئے ہے۔

اچھی طرح سُن لیجئے، عالم اسلام میں ہر وہ عمل جو دین و ایمان کے خلاف کیا جائے گا وہ درحقیقت ہمارے وجود کے خلاف، ہمارے وسائل حیات کے خلاف اور ہماری ترقی کی بنیادوں کے خلاف قرار پائے گا۔

ہم صاحب ایمان قوم ہیں اور ہماری شخصیت کی اساس ہی ایمان ہے ہماری قوت کا راز ہمارا درخشندہ ماضی، ہمارا زوال پذیر حال اور ہمارے مستقبل کی امیدوں کا تمام تر انحصار ایمان ہی کے وجود و عدم پر ہے۔

ہم باایمان قوم ہیں اور یہ ایک بدیہی حقیقت ہے۔ پس واجب ہے کہ اس کی حمایت و اشاعت کیلئے کاتب و محرر کا قلم، خطیب کی زبان، فلسفی کی فکر شاعر مشاعر کا وجدان، مصور کا موئے قلم، قانون ساز کی استعداد، حاکم کا غلبہ و استیلاء لشکر و سپاہ کی قوت اور قومی حمیت...... ہر چیز وقف ہو جائے نیز یہ بھی ناگزیر ہے کہ باپ اس کی رعایت گھر میں رکھے، معلم اس کا خیال اسکول میں

رکھے، پروفیسر کا لیکچر اس کے مطابق ہو، ادیب کی افسانہ نویسی، صحافی کی خبر سازی، مصنف ومؤلف کی تالیف کتب اور ہر فنکار کا فن ایمان کے تقاضوں کو پورا کرتا ہو۔ اور ہر وہ شگاف جو ہماری تہذیبی وثقافتی اور فنی وعلمی زندگی کے کسی پہلو میں بھی کیا جائے، تاکہ شکوک والحاد وانکار کے تیر سینۂ ایمان تک پہنچ سکیں تو یہ امت کے حق میں بہت بڑی خیانت سمجھی جائیگی اسے اس کے اصولوں سے انحراف پر ہی محمول کیا جائیگا، یہ اقدام اس کی صفوں سے نکل کر دشمن کی صفوں میں جا ملنے کے مترادف ہوگا اور دوسرے پہلوؤں پہ کی جانے والی تعمیری ومثبت کوششوں میں رکاوٹ ڈالنے والی بات ہوگی۔

تاہم مجھے اس امر کا پختہ یقین ہے کہ بالآخر دین ایمان ہی کا بول بالا ہوگا اور کفر وتشکک کے مقدر میں سرنگونی وشکست لکھی جائیگی۔ خدائے بزرگ وبرتر نے سچ ہی تو فرمایا ہے۔

''کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ تعالیٰ نے کلمۂ طیبہ کی مثال کیسے بیان کی ہے؟ اس کی مثال ایسے ہے جیسے ایک اچھی ذات کا درخت جس کی جڑ زمین میں گہری جمی ہوئی ہے، اور شاخیں آسمان تک پہنچتی ہیں۔ ہر آن وہ اپنے رب کے حکم سے پھل دے رہا ہے یہ مثالیں اللہ تعالیٰ اس لئے بیان کرتا ہے تاکہ لوگ ان سے سبق لیں اور کلمۂ خبیثہ کی مثال ایک بدذات درخت کی سی ہے جو زمین کی سطح سے اکھاڑ پھینکا جاتا ہے اور اس کیلئے کوئی استحکام نہیں۔'' (ابراہیم:۲۴،۲۶)

*****

پہلا باب

حقیقت ایمان

اس کے عناصر اساسی

اور

اس کی امتیازی خصوصیات

حقیقتِ ایمان

ایمان محض دعویٰ کا نام نہیں۔ کسی شخص کا زبان سے یہ اعلان کر دینا کہ وہ مومن ہے اسے مومن نہیں بنا دیتا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ.

لوگوں میں سے بعض وہ ہیں جو کہتے ہیں ہم اللہ پر اور روز جزا پر ایمان لائے۔ حالانکہ وہ ایماندار نہیں۔

اسی طرح مومنوں کے اعمال سے ملتے جلتے اعمال اختیار کر لینے کو بھی ایمان سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا کیونکہ بارہا ایسا ہوتا ہے کہ بعض دجل وفریب کے علمبردار نیک اعمال کو شعار بنا لیتے ہیں حالانکہ ان کے دل صلاح وخیر سے یکسر خالی ہوتے ہیں ذہنی طور پر بعض حقیقتوں کی معرفت حاصل کر لینے کو بھی ایمان کا نام نہیں دیا جا سکتا اس لئے کہ بہت سے لوگ دلائل وبراہین کی رو سے حقائق ایمان کے قائل ہو چکے ہوتے ہیں۔ مگر تکبر، حسد یا محبت دنیا ان کے راستے میں حائل ہو جاتی ہے اور وہ دولت ایمان سے محروم رہتے ہیں۔

وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا......

اور انہوں نے سربسر ظلم اور تمرد کی بناء پر ان آیات کا انکار کیا حالانکہ ان کے دل قائل ہو چکے تھے۔

ایمان درحقیقت ایک ایسا اخلاقی اور روحانی عمل ہے جو دل ودماغ کی گہرائیوں تک اپنا اثر ونفوذ رکھتا ہے اور انسان کے ارادہ واختیار، عقل وشعور اور وجدان...... ہر چیز کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے وہ وحی والہام کی مدد سے انسان پر حقائق وجود کا انکشاف کرتا ہے اور یہ انکشاف محض علم کی حد تک ہی نہیں رہتا بلکہ جزم ویقین سے ہمکنار ہو جاتا ہے اور پھر ریب وتشکک کا کوئی حملہ بھی اس سے یقین کو متزلزل نہیں کر سکتا۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا.

دراصل ایماندار لوگ وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لائے پھر کسی شک میں مبتلا نہ

ہوئے حقائق کا یہ یقینی علم جو کسی انسان کو ایمان کی بدولت نصیب ہوتا ہے اس کے دل کو ذات حق کے تابع کر دیتا ہے۔ اس کے ارادہ واختیار کو سمع وطاعت سکھاتا ہے اور اس کے تکبر وغرور کو خشوع وخضوع میں بدل دیتا ہے اور بالآخر گوشت پوست کا یہ مجسمہ تسلیم ورضا کا پیکر بن کر سامنے آتا ہے۔ اس کے بعد معرفت حق انسان کے اندر حرارت عمل پیدا کرتی ہے اور عقیدہ وایمان کے مقتضیات کی تکمیل کیلئے اسے سرگرم بنا دیتی ہے۔

ایک مومن کی زندگی کا یہی پہلو ہے...... عملی پہلو...... جسے قرآن خوب نمایاں کر کے اور پورے زور کے ساتھ پیش کرتا ہے مومن کی زندگی محاسن اعمال کا مجموعہ ہوتی ہے۔ وہ بہترین اخلاق کا حامل ہوتا ہے خوف خدا سے اس کا دل معمور ہوتا ہے۔ مصائب ومشکلات میں صبر واستقامت سے کام لیتا ہے۔ اقامت صلوٰۃ اور ایتاءِ زکوٰۃ نیز صیام وحج کے فرائض خلوص دل سے بجالاتا ہے جان ومال سے خدا کی راہ میں جہاد کرتا ہے۔ فواحش ومنکرات اور لغو اور لایعنی امور سے قطعی پرہیز کرتا ہے۔ دن کی مصروفیتیں ہوں یا رات کی خلوتیں، سب میں یاد الٰہی اولیت کا مقام رکھتی ہے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے کبھی دستکش نہیں ہوتا۔ خدا کے اور اس کے بندوں کے حقوق ادا کرتا ہے۔ ہمیشہ سچ بولتا ہے عہد وپیمان کی پابندی کرتا ہے۔ ہر ایک سے لطف ومحبت پیش آتا ہے۔ اور اخوت ومودت کا برتاؤ کرتا ہے۔ غرض بندۂ مومن ہر شعبۂ زندگی میں تقاضائے ایمان کو عملاً پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور لوح ہستی سے کفر وجاہلیت کا ایک ایک نقش مٹا کر چھوڑتا ہے۔ وہ ہدایت وضلالت میں کبھی مصالحت کی کوشش نہیں کرتا، نہ معصیت وطغیان کے بارے میں تساہل اور مداہنت سے کام لیتا ہے اور جب تک اپنے دائرہ اختیار میں برائی کا سر کچل نہیں دیتا اُسے چین نہیں آتا۔

عقیدہ ورائے کا فرق

بعض لوگ عقیدہ وایمان کو فکر ونظر اور خیال ورائے کے معنیٰ میں لے لیتے ہیں۔ حالانکہ عقیدہ ورائے میں بہت بڑا فرق ہے۔ رائے انسان کے دائرۂ معلومات میں ایک چیز کے اضافہ کا نام ہے جبکہ عقیدہ اس کی رگوں میں خون کی طرح گردش کرتا ہے اور اسے سرگرم عمل رکھتا ہے اس کی ہڈیوں کے گودے اور دل کی گہرائیوں میں پیوست ہوتا ہے صاحب رائے کی حیثیت فلسفی کی

سی ہوتی ہے۔ جو ایک بات کو درست سمجھ لیتا ہے حالانکہ وہ حقیقتاً غلط ہوتی ہے۔ آج ایک چیز کے حق میں دلیل دیتا ہے اور اگلے ہی دن اس کے برعکس موقف اختیار کر لیتا ہے۔ اس کے مقابلے میں صاحب عقیدہ، یقین کی دولت سے مالا مال ہوتا ہے۔ وہ شکوک و شبہات کا شکار نہیں ہوتا۔ اس کا عقیدہ حق ہوتا ہے۔ آج بھی حق کل بھی حق۔ وہ دلیل کی زد سے باہر اور ظن و تخمین کی سطح سے بہت بلند ہوتا ہے۔ صاحب رائے کیلئے مفاد یا مصلحت کے زیر اثر بدل جانا بڑا آسان ہوتا ہے، لیکن صاحب عقیدہ اس کردار کا مظہر[1] ہوتا ہے کہ ''اگر میرے دائیں ہاتھ پر سورج اور بائیں پر چاند بھی لاکر رکھ دو اور جس پیغام حق کو لے کر میں آیا ہوں اس سے دستبردار ہو جانے کیلئے کہو تو ایسا کبھی نہیں ہو سکتا، اور میں اپنے مشن کو ہرگز ترک نہیں کر سکتا۔'' رائے کی مثال ایک بے حس و حرکت جسد کی ہے اور عقیدہ اس میں روح حیات پھونکتا ہے رائے ایک ناپائدار قطعۂ نور ہے تو عقیدہ ایک کوکب رخشندہ۔ رائے ایک تاریک غار کی مانند ہے جسے عقیدہ کی روشن شعاعیں منور کرتی ہیں رائے کھڑے پانی کا ایک جوہڑ ہے جس کی سطح پر ضرر رساں حشرات انڈے بچے دے دیتے ہیں اور عقیدہ ایک بحر ذخار ہے جو ایسی کسی مخلوق کو اپنی پر شور لہروں پر توالد و تناسل کی اجازت نہیں دیتا۔ رائے شدائد و مصائب کو جنم دیتی ہے، دشوار راہوں کو پیش کرتی ہے، تن و شکم کے ارمانوں پہ کان دھرتی اور تذبذب اور تردد کو ابھارتی ہے اور عقیدہ خطرات کو عبور کرتا ہوا، پہاڑوں کو اپنی جگہ سے ہلاتا ہوا، زمانے کا رخ پھیرتا ہوا، اور تاریخ کی گردش کو بدلتا ہوا آگے بڑھ جاتا ہے یہاں خدشات کا نام و نشان نہیں ملتا۔ حزم و یقین کی فراوانی ہوتی ہے۔ اور روح کی امنگ کے علاوہ کوئی چیز بار نہیں پا سکتی۔

ایمان کے مشتملات:

عقیدۂ اسلام یعنی ایمان، آسمانی کتابوں کا اصل الاصول ہے جو اللہ، روزِ آخر، ملائکہ، کتب الٰہی اور انبیاء و رسل کی تصدیق سے عبارت ہے۔ اور یہ کوئی نو دریافت چیز نہیں بلکہ آدم علیہ السلام سے لے کر نبی آخر الزماں ﷺ تک جتنے بھی انبیاء و رسل مبعوث ہوئے سب کی تعلیم و تبلیغ کا مرکز و محور

[1] یہ بات نبی اکرم ﷺ نے اپنے چچا ابو طالب سے اس وقت کہی جب انہوں نے حضورؐ کو دینی خدمت سے باز رکھنے کی تلقین کی

یہی عقیدہ رہا ہے۔ ایمان ایک ایسا جوہر ہے جو عہد طفلی سے لے کر دور کہولت تک انسان کے ساتھ رہتا ہے اور اس کی زندگی کے ہر گوشے پر نہایت گہرے اثرات مرتب کرتا ہے۔ یہ وہ عقیدہ ہے جس سے کائنات کی گرہیں کھلتی ہیں۔ راز حیات سے پردہ اٹھتا ہے اور عقل و خرد کی لاینحل گتھیاں سلجھتی ہیں اس عقیدے نے فکر توحید کو ان آمیزشوں سے پاک کیا جن سے ہر دور کی ضلالتیں اسے آلودہ کرتی رہیں۔ مقام نبوت اور منصب رسالت کو اسی نے غلط تصورات سے بچایا اور نکھار کر دنیا کے سامنے پیش کیا۔ آخرت کی جزا و سزا کے بارے میں جاہلوں کے اوہام اور باطل پرستوں کی مغالطہ آمیزیوں کا ازالہ بھی یہی عقیدہ کرتا ہے۔

اس عقیدہ کے عناصر اساسی تین ہیں (۱) ایمان باللہ (۲) ایمان بالرسالۃ (۳) ایمان بالآخرت۔

ا۔ ایمان باللہ:۔

وجود باری تعالیٰ۔ دلائل و براہین سے یہ حقیقت پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ اس کائنات کے پیچھے ایک ایسی قوت کارفرما ہے جو اس کی تدبیر و انتظام میں مصروف ہے کسی نے اسے ''علت اولیٰ'' سے موسوم کیا، کسی نے اسے ''عقل اوّل'' اور کسی نے ''محرک اوّل'' کا نام دیا۔ کتب سماوی میں صفاتِ جمال و جلال کی جامع اسی ذات کو ''اللہ'' سے تعبیر کیا گیا...... اس بلند ترین ہستی اور عظیم ترین قوت...... اللہ عظیم کی حقیت کو پالینا ذہن انسانی کے بس کی بات نہیں جب انسان خود اپنی ذات اور روح کا فہم حاصل نہیں کر سکا اور برق و مقناطیس جیسے بہت سے مادی امور کی تہ تک نہیں پہنچ سکا تو اللہ العلی الکبیر کی ذات کا عرفان حقیقی اس کیلئے کہاں ممکن ہے؟

بادے نہ رسیدی خدا چہ مے جوئی....

البتہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے کرشمے اور اس کی قدرت کے مظاہر ہر جگہ دیکھے جا سکتے ہیں۔ قرآن پاک نے وجود باری تعالیٰ کا اثبات مختلف پیرایوں میں کیا ہے (۱) ہر موجود کو وجود میں لانے والا اور ہر مخلوق کا کوئی خالق ضرور ہونا چاہیے۔ اسی طرح عقل مطالبہ کرتی ہے کہ کائنات کے اس زبردست نظام کے پیچھے کوئی مُنظِم ہو (۲) انسان اپنی فطرت اور اپنے لاشعور میں ایک بلند و برتر ہستی کا تصور موجود پاتا ہے جسے ممکن ہے وہ عیش و عشرت کے ایام میں فراموش کر دے لیکن جونہی مصائب و شدائد کا نزول شروع ہوتا ہے تو وہ ابھر کر اس کے شعور کی سطح پر آ جاتا ہے۔

وَاِذَامَسَّ النَّاسَ ضُرٌّ دَعَوْا رَبَّهُمْ مُّنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ۔ (الروم: ۳۳)

(۳) قرآن، تاریخ سے استشہاد کرتا ہے کہ انسانیت کی نجات وجود باری تعالیٰ پہ ایمان میں مضمر ہے ایک حیرت ناک تسلسل کے ساتھ قومیں تباہ و برباد ہوتی رہیں مگر کچھ مخصوص لوگ بچا لئے جاتے رہے، اگر کوئی حکیم و دانا ہستی موجود نہیں تو آخر تاریخ کے صفحات پر ایک ہی طرح کا فیصلہ کیوں ثبت ہوتا رہا؟

(ب) اِلٰہٌ وَّاحِدٌ۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ''اگر آسمان وزمین میں ایک اللہ کے سوا اور بھی کئی الٰہ ہوتے تو (زمین وآسمان) کا نظام بگڑ جاتا۔ پس پاک ہے اللہ رب العرش ان باتوں سے جو یہ لوگ بنا رہے ہیں۔'' (الانبیاء: ۲۲) ایک اور جگہ فرمایا ''اللہ نے کسی کو اپنی اولاد نہیں بنایا ہے اور کوئی دوسرا خدا اس کے ساتھ نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو ہر خدا اپنی مخلوق کو لے کر الگ جاتا اور پھر وہ ایک دوسرے پر چڑھ دوڑتے پاک ہے اللہ ان باتوں سے جو یہ لوگ بناتے ہیں (المومنون: ۹۱) ان آیات سے بدیہی طور پر یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی شریک نہیں اور نہ اسے کسی شریک کی ضرورت ہے اور نہ یہ نظام کائنات اپنی فطرت کے اعتبار سے کسی شریک خدا کی شرکت کا متحمل ہو سکتا ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ جب پیدا کرنے، رزق دینے اور اپنی مخلوقات کی مشکلات دور کرنے میں اکیلا ہے تو عبادت بھی اس اکیلے ہی کی ہونی چاہیے اور اطاعت و فرمانبرداری بھی اسی وحدہٗ لاشریک کی کی جانی چاہیے اس یکتا و بے ہمتا کے علاوہ کسی سے ڈرنے یا کسی پر بھروسا کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، یہی وہ تعلیم ہے...... توحید باری تعالیٰ اور تقدیس ذات حق کی تعلیم ...... جو تمام انبیاء نے بالاتفاق دنیا والوں کو دی اور لا الٰہ الا اللّٰہ ہی وہ کلمۂ اخلاص اور کلمۂ تقویٰ ہے جسے اہل اسلام نے حرز جان بنایا ہے۔ لاالٰہ الا اللّٰہ تمام جباروں طاغوتی طاقتوں اور معبودان باطل کے خلاف اعلان بغاوت ہے۔ یہ وہ عالمی پکار ہے جو انسان کو انسان کی غلامی اور مادۂ طبیعت کی بندگی سے نجات دلاتی ہے لاالٰہ الا اللّٰہ حقیقی انسانی اخوت، اور سچی عزت و آزادی کی نہایت مضبوط بنیاد ہے یہ الٰہ حقیقی کا تعلق کسی خاص قبیلے، قوم یا ملک سے نہیں جوڑتی بلکہ اسے ''رب العٰلمین'' ''رب السمٰوات''، اور رب المشرق والمغرب قرار دے کر ہر انسان کو اسی کا حلقہ بگوش بننے کی دعوت دیتی ہے۔ لا الٰہ الا اللہ ایک نئے معاشرہ کی تشکیل

کا اظہار ہے جو جاہلی معاشروں سے بالکل مختلف ہوتا ہے عقیدے کے اعتبار سے بھی اور طریق کار کے لحاظ سے بھی یہ معاشرہ نہ مادّی ہوتا ہے نہ وطنی اور نہ طبقاتی۔ بلکہ اسے صرف ذات وحدہٗ، لاشریک سے ایک نسبت خاص حاصل ہوتی ہے۔

(ج) صفات الٰہی کا کمال اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی وحدانیت پر ایمان لانے کے ساتھ ساتھ اس کی جملہ صفات کو کامل و مکمل اور ہر عیب و نقص سے منزہ ماننا بھی لازم ہے۔ ذات حق کی صفات کے کمال پر کائنات کا ذرّہ ذرّہ دلالت کرتا ہے، موجودات میں سے ہر چیز کی انوکھی اور نرالی بناوٹ اس کا حکیمانہ اور متوازن فروغ وارتقاء اس میں حسن و جمال کی کارفرمائی اور اس کی مضبوطی استحکام ایسی خصوصیات ہیں جو پیدا کرنیوالے کی شان کمال کا پتہ دیتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ علیم و خبیر ہے۔ اس سے کوئی چیز مخفی نہیں۔ وہ زبردست قدرت اور بے پناہ طاقت کا مالک ہے کوئی اسے عاجز نہیں کر سکتا نہ اس کے حکم سے سرتابی کر سکتا ہے۔ زندگی، موت، عزت اور ذلت صرف اسی کے ہاتھ میں ہے۔ حکمت و دانائی کا مبدأ و منتہا اور رحمت و رأفت کا منبع وہی ہے اس کی جزا و ثواب اور اس کے انعامات بے حد و حساب ہیں، اور اسی طرح اس کا قہر و غضب اور اس کا انتقام بھی اپنی مثال آپ ہے۔

اسلام جس الٰہ حقیقی سے روشناس ہے وہ کائنات سے بے تعلق الٰہ نہیں جیسا کہ ارسطو نے کہا ہے ارسطو کا الٰہ ہے تو سہی لیکن اسے اس جہان سے کوئی تعلق نہیں۔ نہ وہ اس کی طرف متوجہ ہے نہ اس کی تدبیر امر فرماتا ہے اور فرما بھی کیسے سکتا ہے۔ اسے نہ زمین کے بارے میں کچھ علم ہے اور نہ آسمانوں کے بارے میں وہ نہ جوہر ہے نہ عرض ہے نہ اس کی کوئی ابتداء ہے نہ انتہا۔ نہ وہ مرکب ہے نہ جزء۔ نہ وہ اس عالم میں داخل ہے نہ خارج نہ اس سے متصل ہے نہ منفصل۔ اس ''محرک اوّل'' سے نہ کوئی ڈرتا ہے نہ کوئی لگاؤ رکھتا ہے۔ نہ اس پر بھروسا اور اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ یونانیوں کا الٰہ ایسا ہی تھا اور مغرب کا جدید فکر بھی اسی نوعیت کا الٰہ رکھتا ہے اسکی سرے سے کوئی صفت ہی نہیں صفت کا شان کمال رکھنا تو بعد کی بات ہے۔ اس کے برعکس اسلام جس الٰہ پر ایمان رکھنے کی تعلیم دیتا ہے، وہ حي و قيّوم ہے، علیم بذات الصدور ہے، خالق، مالک اور رازق ہے۔ صاحب امر ہے، مدبر کائنات ہے اور فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْد ہے۔ سب اس کے بندے ہیں۔ آسمان میں ملائکہ اور زمین

پر جن وانس اور دوسری مخلوقات۔جن وانس کو ارادہ واختیار عطا کرنے والا اور نسل انسانی کو اپنی خلافت ونیابت کا شرف بخشنے والا وہی ہے۔وہی ہے حیات وموت کا مالک اور حشر ونشر پہ قادر۔

لَاالٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْکَ لَهٗ لَهُ الْمُلْکُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَعَلٰی کُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ.

۲۔ایمان بالرّسالت:

اللہ پر ایمان لانے کے بعد رسولوں پر ایمان کوئی قابل تعجب چیز نہیں بلکہ یہ ایمان باللہ ہی کی ایک فرع ہے اس لئے کہ انسان کی تخلیق اور اس کیلئے موجودات کی تسخیر کے بعد رحمت حق کیلئے زیبا نہ تھا کہ وہ اسے صراط مستقیم سے نا آشنا رکھ کر بھٹکنے کیلئے چھوڑ دیتی۔بلکہ یہ عین تقاضائے حکمت تھا کہ جس ذات نے انسان کو مادّی سروسامان سے نوازا تھا وہ اس کیلئے روح کی غذا کا اہتمام بھی کرتی اور جس نے اسے پیدائش کے بعد حیات دنیا سے روشناس کیا تھا وہ موت کے بعد حیات آخرت سے بھی اسے باخبر کرتی۔اگر اللہ تعالیٰ انسان کی رہنمائی کا بندوبست نہ فرمائے تو اس کا بدیہی نتیجہ یہ نکلتا کہ خواہشات واحساسات رکھنے والی اس مخلوق کے باطنی قویٰ اور خارجی صلاحیتیں خود اسی کی ذات سے الجھ کے رہ جائیں۔اسی طرح قوم اور جماعت کے اجتماعی اغراض و مصالح بھی تصادم کا شکار ہوئے بغیر نہ رہتے اور یہ صورت حال اس رحمت وعنایت کے منافی ہوتی جس کے تحت تخلیق انسان عمل میں آئی تھی۔اور اس شرف وکرامت کے بھی منافی ہوتی کہ جس کی بدولت حضرت انسان کو کائنات میں منفرد مقام عطا ہوا تھا لیکن بعثت انبیاء کے اس حقیقی پہلو سے صرف نظر کرتے ہوئے نوع انسانی کی اکثریت،اپنی ہی نوع کے کسی فرد کو منصب رسالت پر فائز دیکھ کر اس کا خیر مقدم کرنے کے بجائے حیرت واستعجاب کا اظہار کرتی رہی۔

اَکَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنْ اَوْحَيْنَآ اِلٰی رَجُلٍ مِّنْهُمْ اَنْ اَنْذِرِ النَّاسَ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ قَالَ الْکٰفِرُوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ مُّبِيْنٌ.(یونس:۲)

انسان زندگی کے کسی مرحلہ میں بھی اللہ تعالیٰ کی رہنمائی سے بے نیاز نہیں رہا۔یہ الگ بات ہے اسے اس کا شعور نہ ہو،سب سے پہلے پیدائش کے وقت جب اسے بھوک پیاس کا احساس ہوا تو یہ اللہ تعالیٰ کی رہنمائی ہی تھی کہ جس نے ماں کی چھاتیوں سے اسے غذا حاصل کرنے کی تربیت دی اور ہدائیت کی یہ صورت کچھ انسان کے ساتھ ہی خاص نہیں بلکہ تمام مخلوقات کیلئے عام ہے۔

رَبُّنَا الَّذِيْٓ اَعْطٰی کُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی. (طٰهٰ:۵۰)

پھر دوسرے درجے میں ظاہری وباطنی حواس انسان کی ہدایت کا ذریعہ بنے اور سمع وبصر اور لمس وذوق کی صلاحیتوں نے اس کے دائرہ معلومات کو کچھ اور وسیع کر دیا۔اس کے بعد عقل وشعور کی باری آئی اور بلاشبہ یہ وہ نور تھا جس نے بہت حد تک ظلمت کدۂ حیات میں انسان کی معاونت کی۔اس کو نفع ونقصان کی معرفت بخشی خیر وشر کی تمیز عطا کی اور اعلیٰ اغراض اور عظیم الشان مقاصد کے حصول کو اس کیلئے ممکن بنا دیا۔لیکن یہ سارے ذرائع ہدایت جو بجائے خود ناگزیر اور بہت کچھ نفع بخش تھے ہر لحاظ سے کافی نہ تھے بلکہ اپنے اندر خطا وسہو کا احتمال رکھتے تھے ان سے حقیقت کا کچھ نہ کچھ سرا تو انسان کے ہاتھ لگتا تھا مگر ہر شائبہ التباس کے بغیر اس کی مکمل دریافت نہ ہوتی تھی۔پس اللہ تعالیٰ نے راہنمائی کی وہ بہترین شکل اختیار فرمائی جسے وحی کہا جاتا ہے جس نے حیات انسانی کے ان سربستہ رازوں اور مخفی گوشوں سے پردہ اٹھایا جن تک عقل کی رسائی نہ تھی اور جس نے فکر ونظر کی غلطیاں اور حواس کے اوہام یکسر دور کر دیئے اور حق وصداقت کی صاف اور سیدھی شاہراہ پر کاروان انسانیت کو گامزن کر دیا۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْکِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ. (الحدید:۲۵)

ایمان بالرسالت کے متضمنات۔(ا) رسالت پر ایمان لانا درحقیقت اللہ تعالیٰ کی حکمتِ بالغہ اور رحمت واسعہ پر ایمان لانا ہے۔کیونکہ حضرت حق کو یہ بات پسند نہ تھی کہ حق ابلاغ ادا کئے بغیر انسانوں کا احتساب کیا جائے اور انہیں سزا دے ڈالی جائے۔وَمَا کُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰی نَبْعَثَ رَسُوْلًا. (الاسراء:۱۵)

(ب) ایمان بالرسالت کا ایک اور مفہوم وحدت دین کا اقرار ہے۔اللہ تعالیٰ کے نزدیک ہر دور ہر علاقے اور ہر قوم میں آنے والے انبیاء کا دین ایک ہی رہا ہے۔اگرچہ تقاضائے حالات کے مطابق شرائع میں اختلاف ہوتا رہا ہے۔لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ. (البقرہ:۱۲۶)

(ج) انبیاء ورسل،انسانیت کے حقیقی اور بلند ترین نمونے ہوتے ہیں،وہ مثالی افکار

سے عبارت تجریدی ہستیاں نہیں بلکہ مکارم اخلاق اور فضائل اعمال کی مظہر زندہ شخصیات ہوتی ہیں ان کا تعلق کسی مافوق الفطرت مخلوق سے نہیں بلکہ گوشت پوست کے انسانوں سے ہوتا ہے۔ قرآن اس خیال کی بڑے زور سے تردید کرتا ہے کہ انسانوں کیلئے رسول کوئی غیر انسان ہونا چاہیے اس کے برعکس وہ رسالت کا جو مفہوم ہمارے دل و دماغ میں اتارتا ہے وہ یہ ہے کہ انبیاء نہ خدا ہوتے ہیں نہ خدائی میں شریک ہستیاں اور نہ خدا کی اولاد...... بلکہ وہ بھی بلحاظ تخلیق عام انسانوں جیسے انسان ہی ہوتے ہیں جن پر اللہ تعالیٰ وحی نازل کرتا ہے تا کہ وہ بندوں تک اس کا پیغام پہنچادیں۔

قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ اِنْ نَحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ. (ابراهیم : ۱۱)

۳۔ ایمان بالآخرت:۔

کیا داستان حیات بس اتنی ہی ہے کہ رحم مادر اگل دے اور بطن خاک نگل لے اور اس کے بعد کچھ بھی نہ ہو، یا جیسا کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ زندگی بس یہی دنیا کی زندگی ہے۔ یہیں ہم کو مرنا جینا ہے اور موت کے بعد ہم ہرگز اٹھائے جانے والے نہیں۔” (المومنون: ۳۷) اگر حیات دنیا کی حقیقت یہی ہے تو پھر سوال یہ ہے کہ ہمارے شعور کی گہرائیوں میں اور ہمارے وجدان میں جو زمانہ قدیم سے یہ خیال راسخ چلا آ رہا ہے کہ غایت تخلیق یہی چند سالہ زندگی نہیں بلکہ انسان اس دنیا میں ایک مسافر اور مہمان کی طرح ہے جسے جلد ہی اپنے اصلی گھر لوٹ جانا ہے اس خیال کی بنیاد کیا ہے؟ پوری انسانی تاریخ میں ایک تسلسل کے ساتھ حیات الموت کا تصور ملتا ہے۔ آخر ذہن انسان پر اس کا تسلط کیوں؟ قدیم مصری اسی خیال کے زیر اثر مُردوں کی لاشوں کو حنوط کیا کرتے تھے عقیدہ تناسخ کے پیچھے یہی خیال کارفرما ہے کہ مرنے کے بعد انسان فنا نہیں ہو جاتا بلکہ ایک دوسری زندگی کا آغاز کرتا ہے اور بعض لوگ روح کے جسد خاکی سے جدا ہو جانے کے بعد اسے بحالت تجردہی جزا کی لذت اور سزا کی مصیبت سے دوچار سمجھتے ہیں اور کچھ دوسرے حضرات کا خیال ہے کہ مرنے کے بعد روح موجودہ اجسام سے بہت لطیف مادی پیکروں میں جلوہ گر ہو جاتی ہے اور انسانوں کی ایک بڑی تعداد، وحی کے حوالے سے بعث بعد الموت کا عقیدہ اختیار کئے ہوئے ہے۔ بہر حال خدا کے پرستار بتوں کے پوجنے والے اور فلسفی سبھی اس بات پر متفق ہیں کہ مرنے کے بعد فنا نہیں۔ لہٰذا موت کے بعد زندگی کا یہ شعور جو کم وبیش ہر دل میں پایا جاتا ہے

(سوائے ملحدوں اور مادہ پرستوں کے ایک قلیل گروہ کے) اسے عقل کی گمراہی تو نہیں کہا جا سکتا، وہم کی پیداوار بھی نہیں۔ پھر آخر یہ کیا ہے؟ اس کی ایک معقول توجیہہ یہ ہو سکتی ہے کہ یہ ایک خالص الہامی تخیل ہے جو تخلیق انسان کے وقت خالق نے اس کی فطرت میں ودیعت کیا اور پھر برابر اس کے لاشعور میں جاگزیں رہا۔ انبیاء نے اس مبہم تخیل کو عقل و استدلال کی روشنی میں حقیقت کا جامہ پہنایا اور وحی کے ذریعے اللہ تعالیٰ سے براہ راست علم پا کر حیات بعد الموت کی تفصیلات بیان فرمائیں۔ الہامی تخیل کی یہ توجیہہ عقل و شعور کو بھی اپیل کرتی ہے اور وجدان بھی گواہی دیتا ہے کہ حقیقت یہی ہے۔ آیئے اس نظریہ کو عقل کی کسوٹی پر پرکھیں۔ دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ بعض لوگ چوریاں کرتے ہیں۔ ڈاکے ڈالتے ہیں اور قتل و غارت گری کا بازار گرم کرتے ہیں لیکن قانون کے احتساب سے بالاتر رہتے ہیں، اور بالآخر سینکڑوں اور ہزاروں انسانوں پر ظلم کر کے مر جاتے ہیں اب اگر یہ تمام ظالم اور مظلوم مٹی میں مل کر مٹی ہو جائیں اور کسی مظلوم کو انصاف اور ظالم کو سزا نہ ملے تو اندھیر گردی کی اس کیفیت پہ عقل سر پیٹ کے رہ جائیگی اور تقاضا کرے گی کہ موت کی سرحد پر ہی ہست و بود کا سارا کھیل ختم نہیں ہو جانا چاہیے بلکہ ایک اور عالم برپا ہونا چاہیے۔

اسی طرح کتنے لوگ ہیں جو نیک کام کرتے ہیں۔ بلند مقاصد کیلئے قربانیاں دیتے ہیں اور انسانیت کی فلاح و بہبود کیلئے جہاد کرتے ہیں لیکن دنیا جہالت یا حسد کی وجہ سے ان کے فضل و شرف کا اعتراف نہیں کرتی اور اچھے اعمال کا دنیا میں انہیں کوئی صلہ نہیں ملتا۔ ذرا اپنے دل کو ٹٹول کر بتایئے کہ کیا ان نیک افراد کا محروم جزاء رہنا ٹھیک ہے؟ کیا عقل کے پاس اس بے انصافی کا کوئی جواز ہے؟

پھر بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص بہت سے جرائم کا مرتکب ہوتا ہے۔ اسے دنیا کا قانون بڑی سے بڑی سزا دیتا ہے اور وہ تختۂ دار پر لٹکا دیا جاتا ہے۔ لیکن کیا بے شمار لوگوں کے قاتل، لاتعداد حقداروں کے حقوق کے غاصب اور ان گنت معصوموں پر مظالم ڈھانے والے مجرم کیلئے یہ سزا اس کے جرائم کی نسبت سے مکمل سزا ہے ایسے شخص کو دنیا میں انصاف کا تقاضا پورا کرنے والی سزا دی ہی نہیں جا سکتی اس کیلئے تو کوئی دوسرا ہی عالم ہونا چاہیے۔ اسی طرح بعض

لوگوں کے اصلاحی کارناموں کے اثرات اتنے ہمہ گیر اور دور رس ہوتے ہیں کہ وہ کروڑوں انسانوں کی زندگیاں سنوار دیتے ہیں۔ اب اگر انسانیت کے ان محسنوں کو اپنے حسن عمل کا کوئی بڑے سے بڑا صلہ دنیا میں مل بھی جائے تو کیا وہ مکمل صلہ ہو سکتا ہے یقیناً نہیں۔ لہٰذا ان داعیان خیر وصلاح کو مکمل جزا بھی کسی دوسرے ہی عالم میں مل سکتی ہے۔ اسلام کہتا ہے کہ یہی دوسرا عالم عالم آخرت ہے پس ثابت ہوا کہ حیات الموت کا نظریہ ہی عقلاً صحیح نظریہ ہے اس کے بعد بعث بعد الموت کا انکار کیوں؟ کیا مُردوں کو دوبارہ جلا اٹھانا کوئی ناممکن اور محال کام ہے؟ اس سلسلہ میں قرآن دو طرح استدلال کرتا ہے۔ اس کا پہلا استدلال یہ ہے کہ جو ہستی انسان کو عدم سے وجود میں لا سکتی ہے اس کیلئے اسے دوبارہ زندہ کرنا کیا مشکل ہے۔

فَسَيَقُوْلُوْنَ مَنْ يُّعِيْدُنَا طْ قُلِ الَّذِيْ فَطَرَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ.

وہ ضرور پوچھیں گے کون ہے جو ہمیں دوبارہ زندہ کرے گا؟ کہو وہی جس نے پہلی بار تمہیں پیدا کیا (الاسراء:۵۱) قرآن کا دوسرا استدلال یہ ہے "کہ ان لوگوں کو نظر نہیں آتا کہ جس خدا نے یہ زمین اور آسمان پیدا کئے اور ان کو بناتے وقت جو نہ تھکا وہ ضرور اس پر قادر ہے کہ مُردوں کو زندہ کر لے کیوں نہیں وہ یقیناً ہر چیز کی قدرت رکھتا ہے (الاحقاف:۳۳) اس تصریحات اور واضح حقائق کے بعد بھی آخرت کا انکار کرنے والا کوئی بڑا ہٹ دھرم اور متعصب انسان ہی ہو سکتا ہے۔

دوسری زندگی کا باقاعدہ آغاز مُردوں کے قبروں سے اٹھائے جانے کے ساتھ ہی ہو جائیگا۔ سب سے پہلے ہر انسان کی فرد عمل پیش ہوگی اور اللہ تعالیٰ نہایت کڑا احتساب کرے گا اور ہر شخص پر اس کی نیکوکارانہ یا مجرمانہ حیثیت ناقابل تردید شواہد کی بنیاد پر واضح کر دی جائیگی۔ اس کے بعد سعادت مندوں کا گروہ حیات ابدی سے ہمکنار ہو کر باغ بہشت میں پہنچ جائے گا جہاں ان کے لئے اللہ تعالیٰ نے ایسے ایسے اسباب نعمت مہیا کئے ہوں گے جن سے کوئی آنکھ آشنا نہ ہوگی۔ کسی کان میں ان کی بھنک تک نہ پڑی ہوگی اور کسی دل میں ان کا خیال بھی نہ گزرا ہوگا۔ دوسری طرف بدنصیبوں کا جم غفیر جہنم کے ہولناک شعلوں میں پھینک دیا جائیگا جہاں ہر مجرم اپنی سیہ کاریوں کی پاداش بھگتے گا جہنم کا عذاب مادی روحانی دونوں طرح ہوگا جس کی سختی کا کوئی اندازہ دنیا میں نہیں لگایا جا سکتا نہ یہاں کی اذیت وتعذیب سے اسے کوئی نسبت ہی ہو سکتی ہے۔

ر بَّنَا اصْرِفْ عَنَّا ۚ صلے عَذَابَ جَهَنَّمَ اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا. (الفرقان)

ایمان کی امتیازی خصوصیات:۔

(i) واضح عقیدہ:۔ عقیدۂ اسلام (ایمان) میں جو امتیازی صفات پائی جاتی ہیں وہ کسی دوسرے عقیدہ کو حاصل نہیں یہ ایک واضح عقیدہ ہے اس میں کوئی پیچیدگی اور ابہام نہیں اس کی رو سے اس عجیب وغریب اور محکم ومتوازن کائنات کا ایک رب ہے جس نے اسے پیدا کیا اس کا انتظام فرمایا اور اس میں ہر چیز کو ایک اندازے سے وجود بخشا اس کائنات کا رب ہی وہ معبود حقیقی ہے جس کا کوئی شریک نہیں کوئی شبیہ ومثیل نہیں اس کی نہ کوئی بیوی ہے اور نہ اولاد ہے البتہ آسمانوں اور زمینوں میں جو کچھ بھی ہے اسی کی ملک ہے اور ہر چیز اسی کے تابع امر ہے نیز اس کائنات میں موجود تنوع اور کثرت کے پیچھے عقل جس وحدت وارتباط کی طالب ہے وہ واضح طور پر اس عقیدہ میں پایا جاتا ہے۔

(ii) فطری عقیدہ، یہ عقیدہ فطرت انسان سے نہ تو غیر مانوس ہے اور نہ اس کے مخالف ہے بلکہ اس کی فطرت میں پوری طرح راسخ ہے قرآن میں اس بات کو یوں بیان کیا گیا ہے "پس اے نبی یکسو ہو کر اپنا رخ اس دین کی سمت میں جما دو اور قائم ہو جاؤ اس فطرت پر جس پر اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو پیدا کیا ہے۔ اللہ کی سنت بدلی نہیں جا سکتی یہی بالکل راست اور درست دین ہے مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔ (الروم:۳۰) اسی کا مصداق یہ ارشاد رسول بھی ہے "ہر بچہ دین فطرت پر پیدا ہوتا ہے (یعنی اسلام پر) پھر یہ اس کے والدین ہوتے ہیں جو اسے یہودی بناتے ہیں یا عیسائی یا مجوسی پس معلوم ہوا کہ اسلام ایک فطری عقیدہ ہے جو ہر طرح کے خارجی اثرات سے پاک ہے۔

(iii) ثابت ومحکم عقیدہ، یہ عقیدہ بجائے خود اتنا مضبوط اور محکم ہے کہ اس میں کسی کمی بیشی کی گنجائش نہیں اور نہ کوئی تحریف اور تبدیلی ہو سکتی ہے کوئی بڑے سے بڑا حاکم، علمی اکادمی یا دینی مشاورت اس امر کی مجاز نہیں کہ عقیدۂ اسلام میں کوئی اضافہ کر سکے۔ یا کسی نئی چیز کو اس کی طرف منسوب کر سکے ایسی ہر کوشش کرنے والے کے منہ پر دے ماری جائیگی "مَنْ احدث في امرنا هٰذا ما ليس منه فهو رَدٌّ." (متفق علیہ) قرآن پاک بھی ایسی الحاقی واضافی کاروائیوں کی صاف صاف تردید کرتا ہے اَمْ لَهُمْ شُرَكٰؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَالَمْ يَاْذَنْ بِهِ اللّٰهُ

(الشـــــوریٰ:(۲). ''کیا یہ لوگ کچھ ایسے شریک خدا رکھتے ہیں جنہوں نے ان کیلئے دین کی نوعیت رکھنے والا ایک ایسا طریقہ مقرر کر دیا ہے جس کا اللہ نے اذن نہیں دیا۔ ان تصریحات کے بعد اس امر میں کچھ شبہ نہیں رہتا کہ بدعت یا کوئی اور چیز از قسم اساطیر و خرافات اسلام میں راہ نہیں پا سکتی۔ اگر ایسی کوئی چیز اس میں ٹھونسنے کی کوشش کی جائیگی تو وہ مردود ہوگی اور حجت نہ بن سکے گی۔

(iv) مُدلّل اور مُبرہن عقیدہ۔ عقیدۂ اسلام کوئی ایسا عقیدہ نہیں جو یہ کہے کہ ''پہلے مانو پھر جاننے کی کوشش کرو'' یا ''آنکھیں بند کر کے میرے پیچھے چلے آؤ''۔ اس کے برعکس یہ دلائل و براہین پر مبنی عقیدہ ہے جو دنیا بھر کے لوگوں کو چیلنج کر کے کہتا ہے۔

هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنتُمْ صٰدِقِيْنَ ط (البقرہ: ۱۱۱)

''اگر سچے ہو تو دلیل لاؤ۔'' اسی طرح یہ عقیدہ صرف قلب و وجدان کو ہی مخاطب نہیں کرتا نہ ان پر اعتقاد کی بنیاد رکھتا ہے بلکہ یہ حجت بالغہ، برہان قاطع اور تعلیل واضح کو رہبر بناتا ہے اور ان کی وساطت سے دل و دماغ تک رسائی حاصل کرتا ہے۔ علمائے اسلام کا کہنا ہے کہ منقولات کی اساس معقولات ہیں، نیز نقل صحیح کبھی عقل صریح کی مخالف نہیں ہوتی۔ چنانچہ جب ہم قرآن و حدیث کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں جابجا وجود باری تعالیٰ، اس کی وحدانیت، احیائے موتیٰ اور دوسری بنیادی تعلیمات، انفس و آفاق کے دلائل سے مدلّل ملتی ہیں اور یہ اس بات کا روشن ثبوت ہے کہ ایمان جس چیز کا نام ہے وہ دلیل و حجت سے عبارت ہے اسے جہالت، تعصب، ہٹ دھرمی یا اندھی تقلید سے کوئی سروکار نہیں۔

(v) عقیدۂ وسط و اعتدال:۔ یہ عقیدہ خدا کے منکرین اور بے شمار خداؤں کے قائلین کے بین بین ایک مسلک اعتدال پیش کرتا ہے۔ اور وہ ہے مسلک لا الٰہ الا اللہ یعنی ایک اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اسی طرح صفات باری تعالیٰ کے ضمن میں فلسفۂ یونان کے سلبی تخیلات اور تشبیہ و تجسیم کے ایجابی نظریات کے مقابلے میں عقیدۂ اسلام ایک طرف۔ لیس کمثلہ شیئی اور وَلَمْ یکن له کفواً احُد کہہ کر مشبہیّن کی تردید کرتا ہے تو دوسری طرف فلسفۂ یونان کی تغلیط کرتے ہوئے ذات حق کو حیّ و قیّوم علیم و خبیر، سمیع و بصیر اور فعال لما یرید بھی بتاتا ہے اور

بے شمار دوسری صفات کا بھی اثبات کرتا ہے ایک بے شعور آدمی جو ہر بات میں آبا و اجداد کی پیروی کرتا ہے اور کبھی عقل سے کام نہیں لیتا۔ اور ایک عقل پرست جو ہر چیز کی تہ تک پہنچنے کی دھن میں حقیقت و ماہیت الوہیت کا سراغ لگانا چاہتا ہے...... دونوں کو یہ عقیدہ راہ اعتدال پر لاتا ہے پہلے کیلئے اس کی تعلیم ہے۔

كِتَابٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبَارَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْا آيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ. (ص. ۲۹)

''یہ ایک بابرکت کتاب ہے جسے (اے محمدؐ) ہم نے تمہاری طرف نازل کیا ہے تا کہ یہ لوگ اس کی آیات پر غور کریں اور عقل و فکر رکھنے والے اس سے سبق لیں۔'' اور دوسرے کو کہتا ہے

تَفکّروا فِی خلق اللّٰه وَلا تَفکروا فی اللّٰه فتهلکوا......(حدیث رسولؐ)

اللہ کی پیدا کردہ اشیاء میں ضرور غور و فکر کرو لیکن ذات حق کے بارے میں عقل کے گھوڑے نہ دوڑاؤ، کہیں ایسا نہ ہو کہ ہلاک ہو جاؤ'' دوسرے عقائد کے مقابلے میں نہ تو یہ کمزوری و بزدلی دکھاتا ہے اور نہ غلبہ و استیلاء کی صورت میں مخالف نظریات کا بجبر و قوت خاتمہ چاہتا ہے بلکہ ایک درمیانی راستہ اختیار کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے اس کی تعلیم میں کتنا توازن ہے۔

فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّ لَا يَسْتَخِفَّنَّكَ الَّذِيْنَ لَا يُوْقِنُوْنَ. (الروم: ٦٠)

(الروم: ٦٠) پس اے نبیؐ صبر کرو، بے شک اللہ کا وعدہ سچا ہے اور تمہیں ہرگز ہلکا نہ پائیں وہ لوگ جو یقین نہیں لاتے۔'' اور دوسری طرف بڑی فراخدلی سے اعلان کرتا ہے۔

لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ اور لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ. (الکٰفرون: ۴)

''دین میں کوئی زبردستی نہیں۔ نیز ''تمہارے لئے تمہارا دین ہے اور میرے لئے میرا دین۔'' انبیاء و رُسل کے بارے میں دنیا افراط و تفریط کا شکار ہو جاتی ہے۔ بعض غالی معتقد انہیں درجہ الُوہیت پر فائز کر دیتے ہیں جبکہ بعض دوسرے بد باطن اور خبیث فطرت لوگ انہیں اتباع شہوات اور ارتکاب منکرات کی پستیوں میں دھکیل دیتے ہیں۔ لیکن عقیدۂ اسلام ان کو نہایت پاکباز، عفت و عصمت کے پیکر، تمام انسانوں سے افضل اور خدا کے محبوب بندوں کی حیثیت سے پیش کرتا ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے وحی و رسالت کیلئے انسانوں ہی کے اندر سے منتخب کر لیا ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے بھی یہ عقیدہ ایک عقیدہ وسط ہے جبر و اختیار کے دو انتہائی نظریات میں بھی یہ

ایک بیچ کی راہ دکھاتا ہے اس کی نظر میں انسان نہ تو مجبور محض ہے نہ مختار مطلق اس کی رو سے کائنات میں ایک بااختیار ہستی تو وہ ہے جو تمام اختیارات کا سرچشمہ ہے اور جس کے اختیارات لامحدود ہیں اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْر اور دوسری بااختیار ہستی خود انسان ہے جس کا اختیار محدود ہے اور جو سراسر اللہ تعالیٰ کے اذن ومشیت کے تابع ہے پس انسان اختیار سے بہرہ ور تو ہے لیکن یہ اختیار خدا کا عطا کردہ ہے لہٰذا لامحدود نہیں اور اس کی بالکل نفی بھی غلط ہے۔ وَمَا تَشَاءُوْنَ اِلَّا اَنْ یَّشَاءَ اللّٰہُ۔

عقیدۂ اسلام کا جتنا گہرا مطالعہ کرتے چلے جایئے اس کا افراط وتفریط سے پاک کردار سامنے آتا جائیگا اس کی کسی تعلیم کو اٹھا کر دیکھ لو، انسانیت کو انتہا پسندی سے بچا کر حقیقت پسندی کی راہ اعتدال کا شعور بخشتی نظر آئے گی اور یہی اس کی سب سے بڑی خوبی ہے۔

*****

دوسرا باب

انفرادی زندگی پر ایمان کے اثرات

ایک انسان اپنی زندگی میں کیا چاہتا ہے؟ اسے کس چیز کی تلاش لاحق رہتی ہے؟ اور کن عظیم اور ارفع مقاصد کے حصول کیلئے کوشاں رہتا ہے؟ ان سوالات کا جواب بآسانی دیا جا سکتا ہے بشرطیکہ ہماری نظر گردوپیش کے حالات پر ہو اور تاریخ انسانی سے بھی بخوبی واقف ہو۔

فردکی زندگی پر ایمان کے اثرات

ایک سلیم الفطرت انسان یہ چاہتا ہے کہ اپنے مقام انسانیت کو سمجھے اور ان امتیازی اوصاف کے ساتھ زندہ رہے جن کی وجہ سے وہ انسان کہلانے کا مستحق ہے، اور اس عالم کون ومکان میں اس کی شخصیت کی عزت متعین ہو۔ پھر وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ اسے اپنے وجود کی غایت اور پوری طرح اس کا شعور ہو۔ وہ کیڑے مکوڑوں، چوپایوں اور دوسرے حیوانات کے درمیان ایک منفرد، ممتاز، اور قابل ذکر ہستی کی حیثیت سے رہنا چاہتا ہے۔ علاوہ ازیں فرد کو طاقت بھی درکار ہے عالم مادی کے حادثات وواقعات سے نمٹنے کیلئے، دوسروں کی سرکشی اور خود اپنے نفس کی خواہشات کا مقابلہ کرنے کیلئے قوت کی ضرورت ہے۔ حصول مقاصد اور ادائے فرائض کیلئے وہ قوت کا طالب ہے۔ ایسی قوت جس سے وہ اعلیٰ اقدار حیات کا تحفظ اور کثیر الوسائل معاشرہ کے غلط اور ناپسندیدہ رجحانات کا تدارک کر سکے نیز جو اس کے ضعف جسمانی اور عجز طبعی کا بھی بدل بن سکے۔ مزید برآں انسان کو ایک اور چیز کی بھی تلاش رہتی ہے اور وہ ہے سعادت وخوش بختی۔ انسان اپنے ایام حیات اطمینان قلب اور ذہنی سکون کے ساتھ گزارنا چاہتا ہے۔ وہ رضائے ذات کا طالب اور نیک اور مقدس تمناؤں کا آرزومند ہوتا ہے اور انفس وآفاق پر محبت کی عملداری دیکھنا چاہتا ہے۔

رہے وہ لوگ جو حیوانوں کی طرح زندہ رہنے کھانے اور مٹ جانے کی متمنی ہوں یا درندوں اور بھیڑیوں کی ظلم وزیادتی کے خوگر اور قتل وغارت گری کے دلدادہ ہوں اور انہی مشاغل میں لذت وسرور پاتے ہوں ایسے لوگوں کو کسی درجہ میں بھی انسانیت کا معیار قرار نہیں دیا جا سکتا۔ لہٰذا ان کا ذکر بے فائدہ ہے۔

ان صفحات میں ہم اس بات کا جواب دیں گے کہ فرد کے حقیقی مقاصد اور سچی امنگوں کی تکمیل میں ایمان کیا کردار ادا کرتا ہے۔"

ایمان اور تکریم انسان

انسان، مادہ پرستوں کی نظر میں:۔

انسان کیا ہے؟ ایک مُشتِ خاک جس نے زمین سے نشوونما پائی زمین ہی پر چلتا پھرتا اور کھاتا پیتا ہے اور زمین ہی میں مل جائیگا۔ یہ خون، گوشت اور ہڈیوں کا مجموعہ ہے جس کے مغز استخواں سے اسی طرح عقل وفکر پیدا ہوتی ہے جس طرح جگر سے صفراء۔ انسان کوئی بڑی اہم ہستی نہیں جو دوسری مخلوقات سے ممیز وممتاز ہو۔ بلکہ یہ بھی از قسم حشرات وحیوانات، ایک حیوان ہی ہے جس نے مرور زمانہ سے ترقی کر لی اور اپنی موجودہ شکل کو پہنچا بہر حال اس وسیع وعریض عالم موجودات میں انسان ایک نہایت کمزور وجود ہے جو چند ہزار سال سے کرہ ارضی پر آباد ہے۔ حالانکہ اس کائنات میں خود یہ زمین اور اس پر پائی جانیوالی اشیاء لاکھوں کروڑوں سالوں سے موجود ہیں۔ بلحاظ زمان ومکان انسان کی یہی حیثیت ہے۔ رہا اس کا جسد خاکی تو وہ تقریباً ڈیڑھ سو پونڈ وزن رکھتا ہے جس میں روغنیات کی مقدار اتنی ہوتی ہے جس سے صابن کی سات ٹکیاں بن سکیں اتنی کاربن ہوتی ہے جتنی کہ سات پنسلوں میں اتنا فاسفورس جس سے سوا سو دیا سلائیاں بن سکیں، میگنیشیم اتنی مقدار میں کہ جس سے ایک گھونٹ مسہل دوائی تیار ہو سکتی ہو۔ ایک درمیانہ ساخت کی میخ کے برابر لوہا۔ اتنا چونا جو ایک مرغی خانہ کی سفیدی کیلئے کافی ہو اور گندھک کی اتنی مقدار جس سے ایک کتے کی کھال صاف کی جا سکے نیز دس گیلن پانی، تو یہ ہیں وہ عناصر جن سے انسان کا جسم مرکب ہے اور اتنی مقدار میں مذکورہ عناصر بازار سے چند روپوں کے عوض دستیاب ہو جاتے ہیں اب آپ اندازہ کر لیں کہ مادی انسان کی قیمت کیا ٹھہری۔ ملاحدۂ عرب میں سے ایک معاصر کہتا ہے کیا ہماری کوئی فکر حشرات الارض کی فکر سے بڑھ کر بھی ہے۔ ہم اپنی ذات کے علاوہ کچھ نہیں اور یہی حال حشرات کا ہے ہمیں اثبات ذات کے سوا کچھ نہیں چاہیے ہم میں اور کیڑے

مکوڑوں میں کوئی فرق نہیں سوا اس کے کہ ہم ترقی یافتہ جانور ہیں...... اور وہ کم ترقی یافتہ۔''

ڈارون، فرائڈ اور ان جیسے دوسرے مادہ پرست انسان کو بلندیوں سے روشناس کرانے کی بجائے اسے پستیوں میں دھکیلتے ہیں۔ ان کی نظر میں انسان ایک ترقی یافتہ حیوان ہے جسے روح الٰہی اور ہدایت سماوی کی ہوا تک نہیں لگی۔ انسان کو غلاظت میں آلودہ اور کیچڑ میں لت پت دیکھ کر ان کو کوئی تعجب اور حیرت نہیں ہوتی، البتہ اگر طہارت و پاکیزگی کا ذکر ہو، خواہش نفس اور حرص و آز سے بیزاری کی بات ہو اور انسان رضائے حق کا طلبگار اور اللہ کی راہ میں جان و مال کی بازی لگاتا ہوا نظر آئے تو مادہ پرست حضرات فوراً کان کھڑے کر لیتے ہیں۔

انسان اہل ایمان کی نظر میں:۔

صاحب ایمان کی نظر میں انسان اللہ تعالیٰ کی ایک نہایت باعزت اور باشرف مخلوق ہے جسے اس نے بہترین شکل وصورت عطا کی علم وارادہ کی امتیازی صفات بخشیں مسجود ملائک بنایا اور پھر اسے اپنا نائب بنا کر زمین پر اتارا۔ اور ارض وسموات میں جو کچھ ہے اس کیلئے مسخر کر دیا، ایک حدیث قدسی میں ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہیں ''ابن آدم! میں نے تجھے اپنی اطاعت کیلئے پیدا کیا اور باقی تمام مخلوقات کو تیری خدمت کے لئے تجھ پر میرا یہ حق ہے کہ میرے بتائے ہوئے مقصد زندگی سے نظریں ہٹا کر ان چیزوں کا ہو کر نہ رہ جا جو میں نے تیرے لئے پیدا کی ہیں۔ ابن آدم! تو مجھے تلاش کر، مجھے پالے گا، اگر تو نے مجھے پالیا تو گویا ہر چیز کو پالیا اور اگر تو مجھے ہی نہ پاسکا تو پھر کسی بھی چیز کو نہ پاسکے گا چاہیے کہ میں تیری نظر میں ہر شے سے پیارا بن جاؤں۔

بلاشبہ انسان اس وسیع وعریض کائنات میں بلحاظ وجود کچھ بھی نہیں لیکن اپنی روح اور اپنے معنوی وجود کے اعتبار سے بہت کچھ ہے۔

وَتَزْعَمُ اَنَّکَ جِرْمٌ صَغِیْرٌ وَ فِیْکَ انْطَوَی الْعَالَمُ الْاَکْبَرُ.

ترجمہ: تیرا خیال ہے کہ تو ایک چھوٹا سا وجود ہے۔ حالانکہ تیرے اندر ایک بڑا جہان سمٹ آیا ہے۔

اہل ایمان یقین رکھتے ہیں کہ موت انسانی زندگی کی انتہا نہیں یہ محض ایک مرحلہ ومقام انتقال ہے۔ حیات دنیوی سے حیات اخروی کی طرف، بلکہ حیات ابدی کی طرف سَلَامٌ عَلَیْکُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا خٰلِدِیْنَ. (الزمر: ۷۳)

انسان کا یہی وہ مقام عزت ہے جسکی بنا پر اللہ تعالیٰ نے قرآن کی سینکڑوں آیات میں اس کا ذکر کیا ہے۔ اولین وحی میں انسان ہی کو خطاب فرمایا۔

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ ج خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ O اِقْرَاْ وَرَبُّکَ الْاَکْرَمُ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ O عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ. O

پڑھو اپنے پروردگار کے نام سے جس نے ہر چیز کو پیدا کیا اسی نے انسان کو خون بستہ سے پیدا کیا۔ پڑھو اور یقیناً تمہارا پروردگار بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعے علم بخشا ان باتوں کا انسان کو علم بخشا جو اسے معلوم نہ تھیں۔''

ان آیات میں انسان کا اس کے رب کے ساتھ تعلق بیان کیا گیا ہے پیدائش اور تکریم کا تعلق نیز ہدایت اور تعلیم کا تعلق۔ اسی طرح پورا قرآن انسان کی بلندی درجات اور مدارج کمال کے تذکروں سے بھرا پڑا ہے کہیں اگر فسق وفجور کی پستیوں میں گرے ہوئے انسانوں کا ذکر کیا گیا ہے تو مقصود وہاں بھی یہی ہے کہ اسے قعر مذلت کا احساس دلا کر انہیں اپنی عظمت سے آشنا کیا جائے۔

اللہ کے ہاں انسان کا مرتبہ ومقام

قرآن کی متعدد آیات میں اللہ تعالیٰ کا انسان سے اور انسان کا اللہ تعالیٰ سے قریبی تعلق بیان کیا گیا ہے اور بعض مذہب پسند لوگوں کے اس خیال کی قطعی تردید کی گئی ہے کہ بندے اور خدا کے درمیان کچھ واسطے حائل ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَاِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ (البقرہ:۱۸۶)

اور جب میرے بندے آپ سے میرے بارے میں سوال کریں تو (ان سے کہو) کہ میں (ان سے) بہت قریب ہوں اور پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں۔'' (البقرہ:۱۸۶)

اور یہ کہ:

اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ

الْوَرِیْد (ق. ۱۶)

بلاشبہ ہم نے انسان کو پیدا کیا اور ہم جانتے ہیں اس کا نفس اسے کن وسوسوں میں مبتلا کرتا ہے اور ہم رگ جاں سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں:

اسی مقام قرب کو ایک اور حدیث قدسی میں یوں بیان کیا گیا ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "میں اپنے بندے کیلئے ویسا ہی ہوں جیسا وہ مجھے خیال کرتا ہے اور میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں جب وہ مجھے یاد کرتا ہے اگر وہ مجھے دل میں یاد کرے تو میں بھی اسے دل میں یاد کرتا ہوں اور اگر وہ کسی مجلس میں میرا ذکر کرے تو میں اس سے بہتر مجلس میں اس کا ذکر کرتا ہوں، اگر وہ بالشت بھر میرے قریب ہو تو میں ایک ہاتھ اس کے قریب آجاتا ہوں اور اگر وہ ایک ہاتھ میری طرف بڑھے تو میں دو تین ہاتھ اس کی طرف بڑھتا ہوں وہ میرے پاس چل کے آئے تو میں دوڑ کر اس کے پاس پہنچتا ہوں۔" یہ ہے اللہ کی جناب میں انسان کا مقام۔

ملاء اعلیٰ میں انسان کا مرتبہ:۔

تخلیق آدم سے پیشتر اللہ تعالیٰ نے ملائکہ سے فرمایا کہ میں زمین میں اپنا ایک نائب بنانے والا ہوں، ملائکہ نے خلافت بشری کے بارے میں بعض خدشات کا ذکر کرنے کے بعد کہا۔ مولائے کریم آپ کی حمد وثنا کے ساتھ تسبیح اور آپ کی تقدیس تو ہم کر ہی رہے ہیں۔ ان کا مدعا غالباً یہ تھا کہ ہماری موجودگی میں ایک نئی مخلوق کے سر پر خلافت کا تاج رکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے یہ فرما کر عظمت آدمؑ کی طرف اشارہ کیا کہ جو کچھ میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے اس کے بعد ملاء اعلیٰ میں عظمتِ آدمؑ کا باقاعدہ اعتراف کیا گیا:

اِذْ قَالَ رَبُّکَ لِلْمَلٰئِکَۃِ اِنِّیْ خَالِقٌم بَشَراً مِّنْ طِیْنٍ ○ فَاِذَا سَوَّیْتُہٗ وَنَفَخْتُ فِیْہِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَہٗ سٰجِدِیْنَ. فَسَجَدَ الْمَلٰئِکَۃُ کُلُّھُمْ اَجْمَعُوْنَ. اِلَّا اِبْلِیْسَ ○ اِسْتَکْبَرَ وَکَانَ مِنَ الْکٰفِرِیْنَ ○

جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا میں مٹی سے ایک بشر بنانے والا ہوں پھر جب میں اسے پوری طرح بنا دوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو تم اس کے آگے سجدے میں گر جانا اس حکم کے مطابق سب کے سب فرشتے سجدے میں گر گئے ابلیس نے اپنی بڑائی کا گھمنڈ کیا اور کافروں میں سے ہو گیا۔

اللہ کے حکم سے سرتابی اور فضیلت آدم کا انکار کرنے کی پاداش میں ابلیس لعنت اور پھٹکار کر مستحق ٹھہرا۔

فَاخْرُجْ مِنْھَا فَاِنَّکَ رَجِیْمٌ وَ اِنَّ عَلَیْکَ لَعْنَتِیْ اِلٰی یَوْمِ الدِّیْنِ.

اس طرح عالم بالا میں انسان کو شروع ہی سے نہایت محترم مقام حاصل رہا ہے۔

عالم مادی میں انسان کا مرتبہ ومقام:۔

اس وسیع عالم مادی میں انسان ایک مرکزی شخصیت ہے۔ جو اشرف المخلوقات ہے۔ زمین وآسمان میں جو کچھ ہے اس کیلئے مسخر کر دیا گیا ہے مہر و ماہ جیسے عظیم الشان سیاروں سے لے کر ایک ذرہ قطرہ آب تک کی تخلیق انسان ہی کے استعمال واستمتاع کیلئے ہے۔

اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰہَ سَخَّرَ لَکُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ وَ اَسْبَغَ عَلَیْکُمْ نِعَمَہٗ ظَاھِرَۃً وَّبَاطِنَۃً. (لقمان: ۲۰)

علمائے اسلام کے نزدیک انسان کا مقام:۔

ابوبکر بن العربیؒ:۔ اللہ تعالیٰ کی کوئی مخلوق انسان سے بہتر نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے حَیّ وعلیم، قادر ومتکلم، سمیع وبصیر اور مدبر وحکیم بنا کر پیدا کیا ہے اور یہ صفات خدائے بزرگ وبرتر کی ہیں۔

امام غزالی:۔"انسان اپنے اندر صفات محمودہ پیدا کر لے تو اسے ذات حق کا قرب نصیب ہوتا ہے۔ تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰہِ کا اشارہ اسی طرف ہے ذی علم ہونا خلق خدا پہ احسان کرنا اور لطف وترحم سے پیش آنا، حق کی طرف اس کی رہنمائی کرنا اور کفر وباطل سے اسے بچانا اور ایسے ہی شریعت کے دوسرے احکام پر عمل کر کے انسان خدا کے قریب ہوتا ہے اور اس علی وعظیم ہستی کا قرب خود انسان میں بھی علو وعظمت پیدا کر دیتا ہے۔"

امام ابن قیمؒ:۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی تمام مخلوقات میں سے نوع انسانی کو انتخاب کیا اس کی تکریم کی اور اسے فضل وشرف بخشا اسے اپنی اطاعت وبندگی کیلئے اور باقی تمام چیزوں کو اس کی خدمت کیلئے پیدا کیا اسے اپنی معرفت اپنی محبت اور اپنا قرب عطا کیا۔ ارض وسمٰوات میں جو کچھ

ہے اس کیلئے مسخر کر دیا۔ حتیٰ کہ فرشتوں کو بھی جو بیداری وخواب اور سفر وحضر میں اس کی حفاظت کرتے ہیں اسی پہ اللہ نے اپنی کتابیں اور صحیفے نازل کیئے انسے خطاب فرمایا اور اس سے کلام کیا غرض حضرت حق سے انسان کو وہ مقام بلند نصیب ہوا جو کسی دوسری مخلوق کو نہ مل سکا۔

شرف انسانی کے بعد عزت ایمانی:۔

یہ کرامت وبزرگی تو وہ ہے جو ایک انسان کو بلحاظ انسان حاصل ہے لیکن اگر وہ صاحب ایمان ہو تو عزت وشرف کی انتہائی بلندیوں پر فائز ہو جاتا ہے پھر وہ ''خیرامت'' قرار پاتا ہے اور خدا اور سول کی نظر میں معزز محترم ٹھہرتا ہے۔ وَ لِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ۔ اسے دنیا میں غلبہ داستیلا اور مقام قیادت وسیادت نصیب ہوتا ہے۔ وہ ہر وقت رب جلیل کی تائید ونصرت، حمایت وحفاظت اور معیت ورفاقت میں رہتا ہے اس کا فعل صلاح اعمال کا معیار، اس کا قول محکم ومعتبر اس کی رضا اللہ کی رضا اور اس کا غضب اللہ کا غضب بن جاتا ہے۔ غرض یہ ایمان ہے جو انسان کو سطح خاک سے اٹھا کر اوج افلاک پہ پہنچا دیتا ہے۔

وَمِمَّا زادنی شِرفًا وعِزًا   وکدتُ باخمصی اَطَاُ الثُرِیّا

انسان کے بارے میں اسلام اور مادیت کے تصورات میں فرق:۔

ایک آدمی زندگی بسر کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ وہ بس حیوان ہی ہے جس کی پیدائش سے پہلے کوئی اصول نہیں۔ اور موت کے بعد جس کا سلسلہ آگے نہیں چلتا اور اس کائنات سے جس کا کوئی تعلق نہیں اس کے مقابلے میں ایک دوسرا انسان ہے جو یہ یقین رکھتا ہے کہ وہ زمین پر اللہ کا نائب ہے اور حق وصداقت کے نفاذ، خیر وبرکت کے صدور اور نیکی اور بھلائی کی اشاعت میں اس کی نیابت کر رہا ہے اور جانتا ہے کہ یہ تمام کائنات اس کی خادم ہے ملائکہ اس کے مطیع ہیں اور رب موجودات کی معیت اسے حاصل ہے، نیز اس کا شمار انبیاء صدیقین، شہداء اور صالحین میں ہے کہ جن پر اللہ نے بے حد وحساب انعامات کیئے ہیں۔ یہ دوسرا انسان پختہ اعتقاد رکھتا ہے کہ وہ موت کے ساتھ ختم ہو جانے والا نہیں اور نہ قبر اس کا آخری گھر ہے بلکہ وہ ہمیشہ رہنے کیلئے پیدا ہوا ہے...... ان دونوں انسانوں کے افکار میں یہ عظیم فرق دراصل دو نظریات کا فرق ہے جنہیں اسلام

اور مادیت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

آج انسان کے بارے میں جو فکر، مغربی تہذیب وتمدن کی رہنمائی کر رہا ہے وہ سراسر مادہ پرستانہ فکر ہے جو اسلام سے ذیل کے تین بنیادی امور میں بالکل مختلف ہے۔

(۱) اس کائنات میں انسان کی حیثیت ومنزلت (۲) اس کی فطرت (۳) اس کا وظیفۂ حیات اور اس کی غایت۔

انسان کی حیثیت ومنزلت:۔

عقیدۂ اسلام کے مطابق انسان کی حیثیت زمین میں خلیفۃ اللہ کی ہے جو اپنی تخلیق کے اعتبار سے ایک منفرد، مکرم اور مسئول ہستی ہے اس کا وجود دنیا میں مستقل بالذات نہیں بلکہ اپنے خالق مالک اور پروردگار کے ارادہ ومشیت کے تحت قائم ہے اور صرف اسی کے حکم کا تابع ہے اس کے برعکس مادیت کے علمبردار انسان کو کوئی باشرف مخلوق نہیں سمجھتے ان کی نظر میں وہ از قسم نباتات ایک چیز ہے جو خود بخود عدم سے وجود میں آ گئی اور کچھ عرصہ زندگی گزارنے کے بعد جسے ہلاک اور فنا ہو جانا ہے یا پھر وہ ایک ذی شان حیوان ہے ایک اجتماعیت پسند حیوان اور ایک ترقی پذیر حیوان جو ترقی کے بے شمار مراحل طے کرنے کے باوجود حیوان ہی رہتا ہے فرق اتنا ہے کہ اس حیوان کو علم وتجربہ کی بناء پر مادہ وطبیعیات پر کچھ بالا دستی حاصل ہو گئی ہے لیکن عجیب بات ہے کہ یہی حیوان محدود علم، محدود ارادہ واختیار وکارفرمائی کی محدود صلاحیتوں کو اپنے اندر موجود پا کر خدا ہونے کا دعویدار بن بیٹھتا ہے چنانچہ اس نظریۂ مادیت کے تحت شعور کی دو مختلف صورتیں سامنے آتی ہیں۔

ایک تو انسان کو اپنے بارے میں کم عقل ہستی۔ بے فائدہ وبے کار شے اور حیوان محض ہونے کا شعور ہے اور دوسرا وہ شعور ہے جو انسان میں احساس فخر وغرور اور جذبۂ تکبر وتعلّی پیدا کرتا ہے جس کے تحت ''انسان ہی دنیائے جدید کا صاحب ارادہ خدا ہے لیکن علمی ترقی کے ساتھ ساتھ جب انسان کی آنکھوں کے آگے سے جہالت وطغیان کا پردہ سرکنے لگا اور مشینی انقلاب اور مادی چمک ومک کی حقیقت اس پر کھلنے لگی تو اسے وہ بحران محسوس ہونا شروع ہو گیا جو اس کی ذات میں مادہ پرستانہ افکار قبول کرنے کی بناء پر پیدا ہو رہا تھا۔ اس حقیقت کا سراغ بہت سے مغربی ناقدین کی کتابوں میں ملتا ہے جن میں سے چند ایک یہ ہیں۔ الیکسی کیریل، شپنگلر، الفرڈ کا بن وغیرہ۔

انسان کی فطرت:۔

فطرتِ انسانی حقیقتاً کیا ہے؟ اس مسئلہ کی تہ تک پہنچنے میں مادہ پرستوں کو خاصی دشواری کا سامنا کرنا پڑا ہے ایک مشہور امریکی پروفیسر اپنی کتاب حیات الروح میں لکھتا ہے: ''انسان کی عجیب وغریب اور ملی جلی فطرت ایک ایسا مسئلہ ہے جس نے اہل علم کو زمانہ قدیم سے ورطۂ حیرت میں ڈال رکھا ہے جسمانی پہلو سے دیکھا جائے تو انسان مادہ ہے کیونکہ اس کا جسم پیدا ہوتا ہے۔ جس کے ادراک سے حواس خمسہ عاجز ہیں جو اس جسد خاکی پر حکمرانی کرتی ہے۔ اور جس میں شعور فکر کی صلاحیت پائی جاتی ہے یہی دوسری چیز فطرت انسانی کا وہ پہلو معلوم ہوتا ہے جس میں اس کے وجود کا جوہر مرتکز ہے پس انسان دو چیزوں کا مجموعہ نظر آتا ہے ایک تو مادی وجود ہے اور دوسری کوئی غیر مادی شے کیا یہ دونوں چیزیں حقیقت ہیں یا ان میں سے ایک نرا وہم ہی ہے۔''

یہ ہے فطرت انسانی کی فہم میں مادیت کے پرستاروں کی گمراہی اس کے مقابلے میں دیکھئے اسلام کو فطرت انسانی کے بارے میں کیسی مکمل معرفت اور شعور تام حاصل ہے اس کے نزدیک انسان دو چیزوں سے عبادت ہے۔ جسم کثیف اور روح شفاف...... جسم اس کا تعلق زمین کے ساتھ جوڑتا ہے جبکہ روح اسے بلندیوں پر فائز دیکھنا چاہتی ہے جسم مختلف قسم کے مادی داعیات کی آماجگاہ ہے۔ جبکہ روح انسان کو آفاقی رفعتوں سے ہمکنار کرنے کی کوشش کرتی ہے جسم کے مطالبات، حیوانات کے مطالبات سے مشابہ ہیں اور روح کی امنگیں ملائکہ کے ارمانوں سے ملتی جلتی ہیں جسم روح پر مشتمل یہ وہ مخلوط فطرت ہے جو دفعتہً اور اتفاقاً وجود میں نہیں آ گئی بلکہ اللہ تعالیٰ کی حکمت تخلیق کا نادر نمونہ ہے۔

ذٰلِكَ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ . الَّذِىْ اَحْسَنَ كُلَّ شَىْءٍ خَلَقَهٗ وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ثُمَّ سَوّٰهُ وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ.

''وہی ہے ہر پوشیدہ اور ظاہر کا جاننے والا زبردست اور رحیم جو چیز بھی اس نے بنائی خوب ہی بنائی اس نے انسان کی تخلیق کی ابتداء گارے سے کی۔ پھر اسکی نسل ایک ایسے ست سے چلاتی جو حقیر پانی کی

طرح کا ہے پھر اس کو نک سک سے درست کیا اور اس کے اندر اپنی روح پھونک دی اور تم کو کان دیئے آنکھیں دیں اور دل دیئے مگر تم لوگ کم ہی شکر گزار ہوتے ہو۔''

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے نہ جسم کے تقاضوں کو فراموش کیا ہے اور نہ روح کے مطالبات کو پس پشت ڈالا ہے بلکہ روح اور جسم دونوں کے حقوق ادا کئے ہیں اور اس سلسلہ میں کمال درجہ توازن اور اعتدلال کا ثبوت دیا ہے۔ اس کے برعکس تاریخ کے اوراق شاہد ہیں کہ دوسرے ادیان ومذاہب کے ماننے والے فطرت انسانی سے ناواقفیت کی بناء پر روح کو ترقی دینے کیلئے جسم کی تعذیب کے درپے ہو گئے جیسا کہ ہندومت اور مسیحیت کے پیروؤں نے کیا۔

اس رجحان کے مقابلے میں ایک انتہا پسندانہ رجحان مادیت کے علمبرداروں نے اختیار کیا انہوں نے روح اور خالق روح دونوں کا ہی انکار کر دیا اور جسم کے حیوانی مطالبات کی تکمیل میں اس طرح کھو گئے کہ روح کے تقاضے یکسر نظر انداز ہو گئے اور انسان نرا حیوان بن کر رہ گیا۔

انسان کا وظیفہ حیات اور اس کی غایت:۔

انسان کی تخلیق کارِ عبث نہیں نہ اسے پیدا کر کے بے لگام چھوڑ دیا گیا ہے خواہشات کی بندگی یا موجود عناصر میں سے کسی عنصر کی بندگی بھی اس کا مقصد حیات نہیں جانوروں کی طرح کھانے پینے اور کچھ عرصہ زندہ رہنے کے بعد فنا ہو جانا بھی اس کا مقدر نہیں عقیدۂ اسلام کے مطابق انسان خدا کی بندگی واطاعت کیلئے پیدا ہوا ہے۔ خدا کی مرضی ومنشاء کے مطابق زمین پہ اس کی نیابت کرنے پر مامور ہے۔ اسے تکلیف عمل دی گئی ہے اور بار مسئولیت اس پر ڈالا گیا ہے اور حیات فانی کے آزمائشی لمحات بسر کرنے کے بعد موت کی سرحد عبور کر کے بالآخر اسے حیات خلود وبقا سے ہمکنار ہونا ہے دوسری طرف مادیت کی ملحدانہ فکر انسان کی کوئی منزل اور غایت متعین نہیں کرتی کیونکہ منزل کا تعین کسی مقصد کیلئے ہوتا ہے اور مادیت کا فلسفہ انسان کو ایک بے مقصد حیوان قرار دیتا ہے۔ لہٰذا اس کے پاس انسانیت کے نام کوئی پیغام نہیں۔ الا یہ کہ خوب محنت ومشقت کی جائے تا کہ عیش وعشرت کے اسباب فراہم ہو سکیں بس یہ عیش وعشرت کا حصول اور نفسانی خواہشات کی تکمیل ہی وہ مقصد حیات ہے جو ایک مادہ پرست کے پیش نظر رہتا ہے اس کی مثال ایک مغربی ادیب کے بقول اس کتے کی سی ہے جو اپنی دم پکڑنے کیلئے اپنے ہی گرد گھومتا رہتا ہے۔

اور نہ تو اسے دم ہی ہاتھ آتی ہے اور نہ اس کی گردش ہی رکتی ہے اور اسی بے فائدہ اور بے ہودہ کھیل میں اس کی ساری عمر صرف ہو جاتی ہے قرآن بھی تمثیل کے پیرائے میں نفس کے پرستاروں کی کیفیت بہت پہلے اس طرح بیان کر چکا ہے۔

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِیْ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ. وَلَوْ شِئْنَا لَرَ فَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰهُ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ ج اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ ذَالِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ. (الاعراف ۱۷۵:۱۷۶)

اور اے ہمارے رسولؐ ان کے سامنے اس شخص کا حال بیان کرو جس کو ہم نے اپنی آیات کا علم عطا کیا تھا مگر وہ ان پابندیوں سے نکل بھاگا۔ آخر کار شیطان اس کے پیچھے پڑ گیا۔ یہاں تک کہ وہ بھٹکنے والوں میں شامل ہو کر رہا۔ اگر ہم چاہتے تو اسے ان آیتوں کے ذریعہ سے بلندی عطا کرتے مگر وہ تو زمین ہی کی طرف جھک کر رہ گیا اور اپنی خواہش نفس ہی کے پیچھے پڑا رہا۔ لہٰذا اس کی حالت کتے کی سی ہو گئی کہ تم اس پر حملہ کرو تب بھی زبان لٹکائے رہے اور اسے چھوڑ دو تب بھی زبان لٹکائے رہے یہی مثال ہے ان لوگوں کی جو ہماری آیات کو جھٹلاتے ہیں پس ایسے واقعات بیان کرتا کہ لوگ غور و فکر کریں۔

گذشتہ صفحات کے مطالعہ سے یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ انسان کو جو قدر و منزلت اور عزت و شرف بھی ملا ہے ایمان کی بدولت ملا ہے یہ صفت ایمان ہی کی ہے جس نے انسان کو محبوب خدا مسجود ملائک اور مقصود کائنات بنایا ہے اگر دامن انسانیت متاع ایمان سے خالی ہو جائے تو پھر کوئی جدید سے جدید فکر اور نام نہاد ترقی و تہذیب کی کوئی بڑی سے بڑی کوشش بھی اسے ثریا کی بلندیوں سے ثریٰ کی پستیوں کی طرف لڑھکنے سے بچا نہیں سکتی۔

*****

ایمان اور سعادت وسکینت

سعادت و خوش بختی قلب و نگاہ کی ایک ایسی فردوس گم گشتہ ہے جس کا ہر انسان فطری طور پر طلب گار ہوتا ہے ایک بلند پایہ فلسفی سے لے کر ایک سادہ لوح دیہاتی تک عظیم الشان محل میں مقیم بادشاہ سے لے کر جھونپڑے میں رہنے والے فقیر بے نوا تک ہر شخص گو ہر سعادت کی تلاش میں سرگرداں نظر آتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ یہ گوہر نایاب آخر ہے کہاں؟ انسانیت کی یہ بڑی بدقسمتی ہے کہ وہ اسے ان مقامات پر ڈھونڈتی ہے جہاں اس کا وجود ممکن ہی نہیں ہو سکتا۔ اس شخص کے فاتر العقل ہونے میں کیا شک ہو سکتا ہے جسے تلاش تو لولوئے لالہ کی ہو مگر وہ سمندر کا رخ کرنے کی بجائے صحراؤں کی خاک چھانتا پھرے ایسے شخص کی قسمت میں اگر محرومی نہ ہو گی تو اور کیا ہوگا۔ اسی طرح کے فاتر العقل انسانوں نے گوہر سعادت کو کبھی مادی ساز و سامان کی فراوانی میں تلاش کرنے کی کوشش کی اور کبھی حسی لذات کی تکمیل میں اسے ڈھونڈا مگر ''قیس'' کے حصے میں سوائے دشت پیمائی کے اور کوئی چیز نہ آئی۔

کیا مادی عیش و عشرت کا نام سعادت ہے:۔

لوگوں کا خیال ہے کہ مادی ساز و سامان مال و دولت کی کثیر مقدار اور مادی نعمتوں کی فراوانی سے آدمی سعادت مند بن جاتا ہے لیکن یہ بات صحیح نہیں ان ممالک میں جا کر دیکھئے جہاں عوام کا معیار زندگی بہت بلند ہے کھانے پینے اور رہائش کی سہولتیں ایک سے ایک بڑھ کر لوگوں کو میسر ہیں مگر اس کے باوجود زندگی کی تلخیوں کے گلہ مند ہیں اور اپنے آپ کو شدید گھٹن میں مبتلا پاتے ہیں اس کی وجہ آخر کیا ہے؟ مجلّہ ''روز الیوسف'' کے مدیر اعلیٰ نے کئی سال ہوئے دو مقالے شائع کئے تھے جن کا عنوان تھا ''اہل جنت بھی سعادت مند نہیں'' اہل جنت سے اس کی مراد سویڈن کے باشندے ہیں جو معاشی طور پر اتنے ہی فارغ البال ہیں جتنا کہ کوئی شخص تصور کر سکتا ہے ان کو نہ افلاس کا ڈر ہے نہ بے روزگاری کا خطرہ، نہ بڑھاپے کا خوف حکومت ہر شخص کی ضروریات زندگی کی ضامن ہے وہ معذور اور بے ہنر افراد کی کفالت کرتی ہے رہائش بیماری اور مہنگائی کے الاؤنس دیتی ہے ہر عورت کو بچے کی تولید پر اس کی تربیت اور نگہداشت کا وظیفہ ملتا ہے۔ مزید برآں ہر

بچے کو بھی چالیس مصری پونڈ کے حساب سے سالانہ امداد دی جاتی ہے کارخانوں میں نوجوانوں کو ہنر آموزی کے علاوہ خوراک اور پوشاک کی سہولتیں حاصل ہیں۔ لازمی فرائض کی ادائیگی کے وقت حادثہ کی صورت میں معقول معاوضہ ادا کیا جاتا ہے طلباء کو تعلیمی وظائف اور نو بیاہتا جوڑوں کو گھریلو ساز و سامان خرید نے کیلئے امدادی قرضے دیئے جاتے ہیں غرض ہر فرد کو اجتماعی تحفظ سکیموں کے تحت قومی آمدنی سے پانچ ساڑھے پانچ سو مصری پونڈ سالانہ ملتے ہیں۔ مقالہ نگار صحافی کہتا ہے کہ ایسے معاشرہ میں بھی جس میں قدم قدم پر ہر فرد کی کفالت کا اہتمام ہے لوگ ایک قلق اور اضطراب کا شکار ہیں ان کی زبانوں پر شکایت اور دلوں میں شدید غم و غصہ پایا جاتا ہے اور ان کی مایوسی جب حد سے بڑھ جاتی ہے تو وہ خود کشی کر لیتے ہیں۔ اپنے ہاتھوں اپنی زندگی کا خاتمہ کرنے والے ایک دو نہیں اس ''ارضی جنت'' میں ہزاروں لوگ موجود ہیں۔

امریکہ دنیا کا امیر ترین ملک ہے مگر زر و سیم کی فراوانی اس کے فرزندوں کو بھی سعادت سے بہرہ ور نہیں کر سکی۔ وہاں فلک بوس عمارات ہیں۔ آواز سے تیز چلنے والے طیارے میں سونا اگلتی زمینیں ہیں۔ لیکن اس کے مفکرین کی آواز پر کان دھریں، وہ کہہ رہے ہیں نیویارک کی زندگی ایک حسین و جمیل پردہ ہے جس نے اپنے اندر بربادی و بدبختی کو چھپا رکھا ہے نیویارک کا گراں بار تمدن انسانیت کو کچلتا اور روندتا جا رہا ہے۔ نیویارک کے باشندے آج جس بحران سے دوچار ہیں وہ جذباتیت کا بحران ہے۔ ہر لحظہ کام میں لگے ہوئے اور تھکے ماندے امریکی وقت بچانا چاہتے ہیں یہ سوچے بغیر کہ اس وقت کو وہ کیسے صرف کریں گے۔

ان دو خوش حال ملکوں کے آسودہ عیش کوش باشندوں پہ ایک نظر ڈالنے سے ثابت ہو جاتا ہے کہ کثرت مال اور اسباب عیش و عشرت کوئی ایسی چیزیں نہیں جنہیں ہم سعادت سے تعبیر کر سکتے ہوں سعادت تو درکنار مال و متاع دنیا کی فراوانی حضرت انسان کیلئے الٹا وبال اور مصیبت بن جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں نفاق گزیدہ زرداروں کے بارے میں فرماتا ہے:

فَلَا تُعْجِبْكَ أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُمْ إِنَّمَا يُرِيدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا

ان کے مال و دولت اور انکی کثرت اولاد کو دیکھ کر دھوکا نہ کھاؤ، اللہ تو یہ چاہتا ہے کہ انہی چیزوں کے

ذریعے سے ان کو دنیا کی زندگی میں مبتلائے عذاب کر دے۔

اور یہ عذاب کیا ہے۔ مشقت، تھکاوٹ، غم والم اور بیماری۔ اسی مضمون کی یوں متعدد احادیث ہیں مگر یہاں ایک نقل کی جاتی ہے حضرت انسؓ رسول پاکؐ سے روایت کرتے ہیں آپؐ نے فرمایا ''جس شخص کو آخرت کی فکر دامنگیر رہے اللہ تعالیٰ اس کے دل کو غنی کر دیتا ہے اس کی پراگندگی دور کر دیتا ہے اور دنیا ذلیل ہو کر اس کے قدموں پر آ رہتی ہے۔ اور جسے ہر وقت دنیا ہی کی فکر لاحق رہے اُسے عزت ستاتی رہتی ہے۔ اس کے معاملات پراگندہ ہو جاتے ہیں اور دنیا کی دولت اسے اتنی ہی ملتی ہے جتنی اس کے لئے مقدر ہو۔'' (ترمذی)

کیا سعادت کا راز اولاد میں مضمر ہے:۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ اولاد دنیا کی زینت اور ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ اولاد والدین کے دکھ درد میں شریک اور ان کے عروج اقبال اور نیک نامی کا ذریعہ ہے لیکن یہ اس تصور کا ایک پہلو ہے۔ اگر اس کے سارے ہی پہلو روشن ہوتے تو ہم کہہ سکتے تھے کہ اولاد عین سعادت ہے اس کے برعکس انسانی زندگی کے تجربات بتاتے ہیں کہ اولاد ایک قابل قدر نعمت ہونے کے ساتھ ساتھ بسا اوقات ایک ناقابل برداشت عذاب بھی ثابت ہوتی ہے کتنے ہی والدین ہیں جو اولاد کے ہاتھوں ستائے جاتے ہیں جن کی شقاوت و بدبختی کا سبب اولاد بنتی ہے بڑی محبت سے جس اولاد کی پرورش کرتے ہیں، وہی ان کی زندگی کا خاتمہ کر دیتی ہے اولاد کی نافرمانیوں کے عبرتناک واقعات سے، ان کی آوارگی و خودسری کی تکلیف دہ داستانوں سے اور ان کی مجرمانہ زندگی کے المناک نتائج سے جس طرح والدین کے سینے چھلنی ہوتے ہیں کیا اس کے بعد بھی کہا جا سکتا ہے کہ والدین کی سعادت کا راز اولاد میں مضمر ہے شیکسپیئر نے کہا تھا کہ ''ناگ کے زہریلے ڈنک سے بھی زیادہ المناک چیز اگر کوئی ہے تو وہ نافرمان بیٹا ہے۔'' اور ایک مشرقی شاعر اولاد کے ہاتھوں نازل ہونیوالے مصائب گنانے کے بعد کہتا ہے

لَقَدْ سَعِدَ الَّذِىْ اَمْسٰى عَقِيْماً۔ سعادت مند تو وہ ہے جو بے اولاد ہے

کیا حقیقتِ سعادت تجرباتی علم ہے:۔

علم نے زندگی کے بہت سے نامعلوم گوشے بے نقاب کئے ہیں ۔انسان کو لاتعداد نعمتوں سے استفادہ کا موقع فراہم کیا ہے اس کے لئے مشکل کو آسان اور بعید کو قریب کر دیا ہے تحقیقی تجربات نے اسے کامیابیوں سے روشناس بھی کیا ہے اور مزید اکتشافات کیلئے اس کو پیاس کو بڑھا بھی دیا ہے لیکن اگر یہ کہا جائے کہ معرفت اشیاء حضرت انسان کیلئے عین سعادت ہے تو ایسا نہیں تجرباتی علم نے انسان کو اضطراب دل بخشا ہے اسے خواہش اور طلب عطا کی ہے اور خواہش اور طلب کو سعادت سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا کتنے ہی علماء ہیں جنہوں نے تحقیق و تجربہ میں ساری عمریں کھپا دیں مگر نہ انہیں مقصود ملا نہ گوہر سعادت ہی کا کوئی سراغ لگا۔ دم آخریں حسرت و افسوس کرتے ہوئے اس اعتراف پر مجبور ہو گئے کہ علم نے ان کی ذات کو کوئی فائدہ نہیں پہنچایا۔ نٹشے نے یہ کہہ کر اسی حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ علم پردۂ غیب کو سرکا دیتا ہے لیکن جب ایک پردہ سرکتا ہے تو کئی اور پردے حائل ہو جاتے ہیں اور یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہتا ہے تا آنکہ خود انسان کمزور پڑ جاتا ہے۔ برطانوی فلسفی برٹرینڈ رسل کہتا ہے ''انسان طبیعیات کے میدان میں جب عناصر سے نبرد آزما ہوتا ہے تو علم کے زور پر غالب آ جاتا ہے لیکن جب خود اپنی ذات سے کشتی لڑتا ہے تو علم اس کے کچھ بھی کام نہیں آتا۔ وہ اعتراف کرتا ہے کہ انسانیت کو فلاح و سعادت سے ہمکنار کرنے والی چیز علم نہیں ایمان ہے۔'' ایک مشہور امریکی ماہر نفسیات کہتا ہے کہ تنہا علم قطعاً اس قابل نہیں کہ انسان کیلئے اسباب سعادت کا اثبات کر سکے...... ہم تازہ بتازہ معلومات اور علمی ترقیات سے زندگی کی مشکلات کا شافی حل دریافت نہیں کر سکتے نہ سعادت کے گھاٹ سے سیراب ہو سکتے ہیں کیونکہ علمی ترقی تو اضطراب و تردد کی ترقی سے عبارت ہے۔

سعادت عین ایمان ہے!:۔

سعادت ایک روحانی شے ہے جسے آنکھ سے دیکھا نہیں جا سکتا ہے نہ کسی پیمانے سے ناپا جا سکتا ہے نہ اسے دینار، روبل، ڈالر یا پونڈ سے خریدنا ہی ممکن ہے اس کا تعلق انسان کے باطن سے ہے اور پاکیزگی نفس، اطمینان قلب، انشراح صدر اور راحت ضمیر اس کی علامات ہیں۔ کہتے ہیں

کہ ایک شخص اپنی بیوی سے ناراض ہو گیا اور اسے دھمکانے لگا کہ میں تجھے شقاوت اور بدبختی سے دوچار کر دوں گا۔ بیوی نے پرسکون لہجہ میں جواب دیا۔'' آپ ایسا نہیں کر سکتے آپ نے مجھے شقی بنانے کی استطاعت رکھتے ہیں اور نہ میری سعادت خوش بختی پہ قادر ہیں۔'' خاوند غیظ و غضب کے عالم میں بولا کیسے''؟ بیوی نے اعتماد اور یقین کے ساتھ کہا اگر سعادت روپے پیسے میں ہوتی تو وہ آپ روک سکتے تھے زیورات اور ملبوسات میں ہوتی تو آپ ان سے مجھے محروم کر سکتے تھے لیکن وہ تو ایسی چیز میں پنہاں ہے جو آپ کے بس میں نہیں اور ایک آپ ہی کیا تمام دنیا کے انسان مل کر بھی اس پر قادر نہیں ہو سکتے۔ خاوند نے حیرت و استعجاب کے ساتھ پوچھا'' وہ ہے کیا چیز؟'' بیوی نے کہا'' میری سعادت میرے ایمان میں مضمر ہے اور میرا ایمان میرے دل میں ہے اور میرے دل پر میرے رب کے سوا کسی کا قبضہ نہیں۔'' یہ ہے ایمان اور سعادت کا باہمی تعلق تاہم اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اسلام میں مادی سروسامان کو بالکل نظر انداز نہیں کیا گیا۔ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ ابن آدم کی سعادت کیلئے صالح بیوی اچھا گھر اور عمدہ سواری کافی ہے ایک دوسرے مقام پر آپ نے فرمایا۔'' جو شخص اپنے گھر میں امن سے رہتا ہے صحت و عافیت سے بہرہ ور ہے اور اس کے پاس ایک دن کا سامان خوراک موجود ہے گویا اس کیلئے پوری دنیا سمیٹ دی گئی ہے۔''

مندرجہ بالا تصریحات اور حضور پاکؐ کے ارشادات سے ثابت ہو جاتا ہے کہ گوہر سعادت انسان کو ایمان کے نتیجے میں حاصل ہوتا ہے۔ ایمان کا ماحول ہی وہ سازگار ماحول ہے جس میں شجر سعادت نشوونما پاتا ہے اور امن و سکینت، محبت، رضا اور امید کے برگ و بار لاتا ہے رہا مادّی سروسامان تو اس کی نہایت قلیل مقدار بھی کافی ہے۔ یہ قلیل مقدار انسان کی سعادت میں نہ کمی کرتی ہے نہ رکاوٹ ڈالتی ہے۔

اَلاَ بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطمَئِنُّ الْقُلُوْب.

سعادت مند انسان جن نعمتوں سے نوازا جاتا ہے ان میں سے ایک بڑی نعمت اطمینان قلب ہے اب ہم اس بات کا جائزہ لیں گے کہ آیا سکینت نفس اور طمانیت قلب کسی اور چیز سے بھی حاصل ہو سکتی ہے یا صرف دامن ایمان ہی ایک ایسا دامن ہے جس میں یہ متاع بے بہا پائی جاتی ہے۔

اطمینان قلب ایمان کے بغیر نصیب نہیں ہوسکتا:۔

دنیا میں اصحاب علم اور ارباب فن موجود ہیں قوت وطاقت رکھنے والوں کی کمی نہیں حسن وجمال کے پیکر بھی پائے جاتے ہیں بے حساب خزانوں کے مالک قارون بھی ہیں اور باجبروت شہنشاہوں کے اقتدار کا ڈنکا بھی بج رہا ہے۔ان سے پوچھیئے کیا وہ اطمینان قلب کی دولت سے مالا مال ہیں؟ جواب یقیناً نفی میں ملے گا۔اور یہ منفی جواب حقیقت کے اثبات کیلئے کافی ہے کہ مذکورہ صفات اور انعامات بجائے خود کتنے ہی قابل قدر ہوں۔اطمینان قلب کا بدل ہرگز نہیں بن سکتے۔

سکون قلب کی جنس نایاب کا مصدر ومنبع صرف ایک چیز ہے اور وہ ہے ایمان باللہ ایسا ایمان جو صادق اور عمیق ہو جسے شک نے مکدر نہ کر دیا ہو، اور نفاق جس میں فساد نہ پیدا کر چکا ہو۔ سکینت ایک عطیہ ربانی ہے جو اہل زمین میں سے صرف مومنین کے دلوں پر نازل ہوتا ہے تا کہ جب لوگ مضطرب ہوں تو وہ خاطر جمع رکھیں جب لوگ غضبناک ہوں تو وہ صبر ورضا کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں اور جب لوگ شکوک وشبہات میں مبتلا ہوں تو وہ یقین کی دولت سے سرشار رہیں یہی سکینت تھی جس سے ہجرت کے روز رسول اللہؐ کا سینہ مبارک معمور تھا جب آپؐ نے اپنے ساتھی کی پریشانی اور گھبراہٹ پہ فرمایا ''اے ابوبکرؓ تمہارا ان دو کے بارے میں کیا خیال ہے جن کا تیسرا خود اللہ ہے۔''نیز یہ کہ'' گھبراؤ نہیں اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے۔''

اسباب سکینت:۔

(۱) مومن فطرت کی آواز پہ لبیک کہتا ہے۔وہ ہمیشہ فطرت سے ہم آہنگ رہتا ہے وہ جانتا ہے کہ انسانی فطرت دو چیزوں سے عبارت ہے مشت خاک اور روح پاک، وہ ہر معاملہ میں جانب خاک ہی نہیں جھکا رہتا کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ اندھے بہرے مادے کے پاس آلام حیات کا کوئی علاج نہیں وہ مادی احتیاجات کی تسکین کے ساتھ روح کے تقاضوں کو بھی بطریق احسن پورا کرتا ہے کیونکہ سکون کی دولت تو اسے روح کے تقاضوں کو پورے کرنے ہی سے مل سکتی ہے۔ابن قیمؒ فرماتے ہیں ''دل میں پراگندگی پیدا ہوتی ہے جسے رجوع الی اللہ سے ہی دور کیا جاسکتا ہے۔

اسے وحشت لاحق ہو جاتی ہے جسے ذات حق سے انس ہی زائل کرسکتا ہے قلب میں حزن وملال گھر کر لیتا ہے جس سے معرفت ربانی کا سرور ہی نجات دلاسکتا ہے۔دل قلق اور اضطراب کا شکار ہوتو اسے ذکر الٰہی سے سکون اور قرار نصیب ہوتا ہے اس میں حسرت کی آگ بھڑک اٹھے تو قضائے الٰہی کا تصور اسے بجھا دیتا ہے۔''غرض دل کے یہ تمام روگ اسی وقت دور ہوتے ہیں جب انسان اپنی فطرت کے مادی پہلو کی طرف نہیں بلکہ روحانی پہلو کی طرف متوجہ ہوتا ہے پس مومن ہر وقت اس لئے پرسکون رہتا ہے کہ وہ اپنی فطرت سے انحراف نہیں کرتا۔

مومن اپنی حقیقت سے واقف ہوتا ہے:۔

روح کی گہرائیوں میں کچھ سوال ابھرتے ہیں جن کا صحیح جواب ہر شخص سے اس کی فطرت مانگتی ہے اور وہ سوالات یہ ہیں انسان کیا ہے؟ یہ جہاں کیا ہے؟ انہیں کس نے بنایا ہے؟ کیوں بنایا ہے؟ اس وسیع وعریض کائنات کے ساتھ انسان کا کیا تعلق ہے؟ اس کی تدبیر وانتظام کس کے سپرد ہے؟ زندگی اور موت کی حقیقت کیا ہے؟ اس زندگی کے بعد ہمارا کیا حشر ہونے والا ہے؟ یہ اور اسی قسم کے کئی اور سوالات ہیں جن کا شافی جواب اگر مل جائے تو کوئی چیز انسان کیلئے وجہ پریشانی نہیں بن سکتی لیکن اگر ان امور کے بارے میں دل ودماغ تذبذب کا شکار ہوں تو پھر کوئی بڑے سے بڑا سہارا بھی سکون وقرار کا موجب نہیں ہوسکتا۔

جہاں تک ایک مومن قانت کا تعلق ہے وہ اس حقیقت سے اچھی طرح آگاہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے اور زمین پر اس کا نائب ہے۔اللہ نے ہی پوری کائنات کو پیدا فرمایا ہے اور وہی اس کی تدبیر امر فرماتا ہے۔ایک وقت معین تک اس نے جملہ موجودات کو انسان کیلئے مسخر کر دیا ہے تا کہ ارادہ واختیار کی آزادی دے کر اس کی آزمائش کی جاسکے اس نے انسان کیلئے دنیا کو دار العمل بنایا ہے اور موت کے بعد کا علم دار الجزاء، آخرت میں سے اپنے ایک ایک عمل کی خدا کے سامنے جواب دہی کرنی ہے۔یہاں جو کچھ وہ بوئے گا وہی آگے چل رہ ـــ ہ یز یہ کہ اس جہان کی ناپائدار زندگی حقیقی زندگی نہیں اس لئے یہ جس حال میں بھی گزرے صبر وشکر اور اطاعت واستقامت کے جذبے سے گزار دینی چاہیے اصل زندگی آخرت کی لافانی زندگی ہے جس کے بناؤ اور سنوار پر ہر وقت انسان کی نظریں مرکوز رہنی چاہئیں۔اور آخرت اسی کی سدھرے

گی جو دنیا میں خدا کا بندہ بن کر رہے گا۔حیات دنیا کی فلاح وکامرانی کا راز بھی بندگی حق میں ہی مضمر ہے۔غرض دارین کی سعادت اسی شخص کا حصہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق زندگی بسر کرے اور دونوں جہان کی بدبختی اس کا مقدر ہے جو احکام الٰہی سے انحراف کرے اسلام کی یہی وہ تعلیمات ہیں جن میں مذکورہ بالا تمام سوالات کا جواب موجود ہے اور روح الٰہی کے فراہم کردہ اس علم حقیقت نے مومن کو ہر قسم کی کدوکاوش سے نجات دلا دی ہے حقیقت ہستی کے اس شعور کے بعد بندۂ مومن کو کوئی دکھ، تکلیف، کوئی غم وفکر اور کوئی مایوسی ومحرومی بے تاب اور بیقرار نہیں کرتی۔

مومن کی راہ اور منزل واضح ہوتی ہے:۔

ایمان سے محروم لوگ اس لئے بھی غیر مطمئن زندگی بسر کرتے ہیں کہ ان کی منزل متعین نہیں ہوتی اور راہ بھی غیر واضح ہے کبھی وہ ایک سمت میں چلنے لگتے ہیں اور کبھی بالکل دوسری سمت میں کبھی انہیں کسی کی خوشنودی مطلوب ہوتی ہے اور کبھی کسی کی اسی کشمکش میں ان کی عمر گزر جاتی ہے اور تذبذب اور تامل کی کیفیت لمحہ بھر کیلئے بھی انہیں سکھ کا سانس نہیں لینے دیتی ان کی مثال اس روایتی بوڑھے اور اس کے بیٹے کی سی ہے جن کے پاس ایک ہی گدھا تھا پہلے بوڑھا سوار ہو گیا اور بیٹا پیدل چلنے لگا تو قریب سے گزرنے والی چند عورتوں نے باپ کو ملامت کرنا شروع کر دی کہ زندگی کی اتنی بہاریں دیکھنے کے بعد دنیا سے اس کا جی نہیں بھرا اور نوعمر بیٹے کو پیدل چلنے پر مجبور کر رہا ہے ان باتوں کا یہ اثر ہوا کہ باپ نیچے اتر آیا اور بیٹا گدھے پر سوار ہو گیا۔ابھی چند قدم ہی آگے گئے تھے کہ کچھ اور آدمی بیٹے کو کوستے ہوئے کہنے لگے دیکھو اس جوان کو شرم نہیں آتی خود سوار ہے اور ضعیف باپ پیدل چل رہا ہے۔آخر باپ بیٹا دونوں سوار ہو گئے تو گدھے کی مظلومیت کا رونا رونے والے آگئے اور جانور کے حق میں رحم کی اپیل کرنے لگے۔نتیجۃً دونوں گدھے سے اتر آئے اور پیدل چلنے لگے ابھی تھوڑا ہی فاصلہ طے ہوا تھا کہ بعض دانشور قسم کے راہگیر جانور رکھنے کے باوجود سواری نہ کرنے پر انہیں بے وقوفی کا طعنہ دینے لگے۔تنگ آکر بیٹے نے فیصلہ کیا کہ ابا جان گدھے کی ٹانگیں باندھ کر اسے سروں پر اٹھالیں شاید لوگ راضی ہو جائیں مگر بوڑھے باپ نے جواب دیا بیٹا ایسی صورت میں ایک تو ہم مصیبت میں پھنس جائیں گے دوسرے لوگوں کی زبانیں پھر بھی بند نہیں ہوں گی جوان آخر جوان تھا اس نے اصرار جاری رکھا اور باپ کو اس کام پر مجبور کر دیا

چنانچہ گدھے کے یہ خیر خواہ لوگوں کو راضی کرنے کی دھن میں اسے اٹھائے ہوئے ایک ندی کا پل عبور کر رہے تھے کہ نمعلوم گدھے کے جی میں کیا آئی کہ اس نے پانی میں چھلانگ لگا دی اور باپ بیٹا دونو کو لے ڈوبا۔

ٹھیک یہی حالت جادۂ حیات میں صفت ایمان سے بے بہرہ لوگوں کی ہوتی ہے وہ ہر ایک کو راضی کرنا چاہتے ہیں مگر کسی کو بھی راضی نہیں کر پاتے۔انہیں اپنا مفاد اور اپنا عیش وآرام عزیز ہوتا ہے مگر ان چیزوں کو خاطر خواہ نہ پا کر ہمیشہ رنج وغم میں مبتلا رہتے ہیں۔لیکن مومن کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہوتا ہے وہ کامل یکسوئی کے ساتھ خدا کے بتائے ہوئے طریق زندگی پر گامزن رہتا ہے اسے اس بات کی بالکل پروا نہیں ہوتی کہ کوئی اس کی روش سے ناراض ہوتا ہے یا ناخوش۔راستے کے نشیب وفراز سے گزرتے وقت وہ نہ تو چمکتے ہوئے سکوں کے ڈھیروں کی طرف دیکھتا ہے نہ حسّی خواہشات اسکے راستے میں حائل ہوتی ہیں اور نہ شدائد ومصائب اور قتل واستہلاک کے دلدوز مناظر اسے پریشان کرتے ہیں اور نہ کوئی بڑے سے بڑا لالچ خوف یا دباؤ اسے جادۂ مستقیم سے ہٹاتا ہے اس دوران میں اس کی توجہ صرف صحتِ سمت اور منزل مقصود پر مرکوز رہتی ہے وہ راہ راست سے ذرہ برابر ہٹنا نہیں چاہتا اور رب العلمین کی رضا کو ہر شے پر مقدم رکھتا ہے کہ یہی اس کی آخری منزل ہے اس منزل کو پالینے کا یقین اسے ہر مرحلہ میں سکینت وطمانیت سے سرشار رکھتا ہے چاہے وہ مرحلہ تختۂ دار کو چومنے کا مرحلہ ہی کیوں نہ ہو ایسے ہی ایک مرحلہ پر حضرت خبیبؓ بن عدی نے فرمایا تھا۔

وَلستُ ابالی حین اُقتل مسلمًا　　علیٰ ایّ جنبٍ کان فی اللّٰہ مصرع
وذالک فی ذات الالٰہ وان یشأ　　یبارک علیٰ اوصال شلوٍ ممزّع

مجھے کچھ پروا نہیں اگر میں بحیثیت ایک مسلم کے قتل کیا جاؤں، کوئی پروا نہیں کہ اللہ کے معاملے میں مجھے کس پہلو مار گرایا جاتا ہے مجھے معبود حق (پہ ایمان لانے) کی وجہ سے قتل کیا جارہا ہے۔وہ ذات اگر چاہے تو بریدہ اعضاء کو بھی بابرکت بنا سکتی ہے:

مومن موجودات سے مانوس ہوتا ہے:۔

جملہ موجودات کے بارے میں ایک صاحب یہ سمجھتا ہے کہ یہ بھی اس کی طرح اللہ کی مخلوقات ہیں اور اللہ کے احکام کی پابند ان میں سے کوئی چیز بھی بذات خود اسے نہ نقصان پہنچا سکتی

ہے۔نہ نفع بلکہ نفع اور نقصان کے تمام اختیارات اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھ میں رکھے ہیں ان حقائق کے ادراک کے بعد مومن کسی چیز سے متوحش نہیں ہوتا کیونکہ وہ مخلوقات کی وسیع برادری میں اپنے آپ کو ایک معزز اور محترم رکن سمجھتا ہے۔ایسا رکن کہ جس کو دوسری اشیاء پر ایک حد تک تصرف کے اختیارات حاصل ہیں۔اسی بناء پر زمین،سورج،چاند،سمندر،بیابان،ندی،نالے،ہوائیں، بادل،درخت،پودے،جمادات اور حیوانات غرض کسی چیز کی طرف سے کوئی خوف یا ادنیٰ سی بے اطمینانی بھی اس کے دل میں پیدا نہیں ہوتی۔موجودات کے وسیع وعریض کارخانے کو دیکھ کر مومن ایک نہایت خوشگوار اثر یہ قبول کرتا ہے کہ تنگی اور گھٹن سے اسے نجات مل جاتی ہے کائنات کی وسعتیں اس کے سینے کو بھی فراخ کر دیتی ہیں وہ ارض وسماء کی پہنائیوں اور بے کرانیوں کو دیکھ کر اپنی بے بسی اور لاچارگی کا خول توڑ پھینکتا ہے اور بلند حوصلہ اور عالی ظرف انسان کی حیثیت سے زندگی بسر کرتا ہے اور کبھی کسی معاملہ میں بھی تھڑ دلی کا مظاہرہ نہیں کرتا۔دل کی یہ کشادگی جب ایک مومن میں پیدا ہو جاتی ہے تو اس کے بہت سے مسائل اور لاتعداد پریشانیوں کا خاتمہ خود بخود ہو جاتا ہے۔

مومن کو اللہ تعالیٰ کی معیت حاصل ہوتی ہے:۔

انسان کی بہت سی مصیبتوں اور پریشانیوں کا علاج اس کے عزیز واقارب اور دوست احباب کر دیتے ہیں لیکن بعض پریشانیاں ایسی ہوتی ہیں کہ جن میں کوئی بھی اس کے کام نہیں آ سکتا۔ایسے عالم میں تنہائی کا جو احساس اسے ہوتا ہے ایک مغربی دانشور کے قول کے مطابق وہ ایسا مرض ہے جو عقلی اضطرابات کے بنیادی عوامل میں سے سب سے اہم ہے اس مرض کا مداوا ڈھونڈنے کی علمائے نفسیات نے بہت کوشش کی ہے لیکن بے شمار تجربات کے بعد انصاف پسند اطباء اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اس کا بہترین علاج صرف دین اور ایمان کے پاس ہے ایمان کی آغوش میں پناہ لے کر ہی انسان کو اللہ کی معیت کا احساس ہوتا ہے اور وہ نہایت مشکل اور کٹھن حالات میں بھی اپنے آپ کو تنہا نہیں پاتا قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَلِلّٰہِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْہُ اللّٰہِ اِنَّ اللّٰہَ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ. (البقرہ:۱۱۵)

اور مشرق ہو یا مغرب دونوں اللہ ہی کے ہیں تو جدھر بھی تم رخ کرو اسی طرف اللہ ہے اللہ بڑی گنجائش رکھنے والا اور علم والا ہے۔

وَھُوَ مَعَکُمْ اَیْنَ مَا کُنْتُمْ وَاللّٰہُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ. (الحدید)

وہ تمہارے ساتھ ہے جہاں بھی تم ہو جو کام بھی تم کرتے ہو۔اسے وہ دیکھ رہا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے تعاقب سے بنی اسرائیل کو اطمینان دلاتے ہوئے جو حرف تسلی ادا فرمایا تھا وہ یہی تھا کہ:

قَالَ کَلَّا اِنَّ مَعِیَ رَبِّیْ سَیَھْدِیْنِ. (الشعراء ۶۲)

میرے ساتھ میرا رب ہے وہ یقیناً میری رہنمائی فرمائے گا۔

اور جب دامن کوہ پہ کھڑے دشمنان اسلام کو دیکھ کر حضرت ابوبکرؓ گھبرائے تو آپؐ نے فرمایا "لَاتَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا۔ یہ معیت الٰہی کا یقین ہی تو تھا جو رسول اللہؐ کے الفاظ کے قالب میں ڈھل گیا تھا۔پس ثابت ہوا کہ مومن کہیں بھی ہو اور کیسے ہی حالات میں گھرا ہوا ہو وہ ہر وقت اس یقین وایمان سے سرشار رہتا ہے کہ اس کا خدا اس کے ساتھ ہے جو اس کی مدد پر قادر ہے اور اسے ہر مشکل اور مصیبت سے بچانے کی پوری قدرت رکھتا ہے۔لہٰذا اس کیلئے پریشانی کی کوئی بات نہیں معیت الٰہی کا یہ تصور جو ہر مومن کے دل میں جاگزیں ہوتا ہے۔اس کے سکون واطمینان کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔

نماز اور دعا بھی اسباب سکینت میں سے ہیں:۔

سکینت کے جن اسباب وذرائع تک مادّہ پرستوں کی رسائی نہیں ان میں سے ایک نماز اور دعا ہے نماز مومن کا وہ کارگر ہتھیار ہے جس سے آلام وحوادث میں مدد حاصل کرنے کی تلقین خود خدا نے کی ہے۔

یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ. (البقرہ:۱۵۳)

رسول اللہؐ کو جب کوئی پریشان کن مسئلہ درپیش ہوتا تو آپ نماز کا اہتمام فرماتے اور اپنے آقائے حقیقی کی جناب میں حل مشکل کیلئے عرض مدعا کرتے نماز کا یہی وہ سکون بخش پہلو ہے جس

کی طرف آپ نے اس ارشاد فرمایا ہے'' جُعِلَتْ قُرَّةُ عَيْنِيْ فِي الصَّلٰوةِ ''میری آنکھوں کی ٹھنڈک کا سامان نماز میں رکھ دیا گیا ہے، دعا یا صلوٰۃ کمزور و ناتوان انسان کا تعلق اس ذات سے جوڑتی ہے جو علیم وخبیر اور علیٰ کل شیءٍ قدیر ہے جس کا دروازہ ہر وقت کھٹکھٹایا جا سکتا ہے اور جس کے در رحمت سے محروم لوٹنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ نبیؐ جب طائف کے اوباشوں کے ہاتھوں انتہائی ناروا سلوک برداشت کر کے بہت مجروح اور لاچار ہو گئے تو آپ نے بارگاہ رب العزت میں درست دعا اٹھائے۔ اس وقت آپ کی زبان مبارک سے نکلنے والے کلمات پر ایک نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ کے نزدیک دعا کا مقام کیا ہے اور وہ اپنے اندر کتنا وافر سامان سکینت رکھتی ہے۔

اللّٰھم اشکو الیک ضعف قوتی وقلة حیلتی وَھوانی علی الناس یاارحم الراحمین انت رب المستضعفین دانت ربیّ.

اے اللہ میں اپنی قوت اور اپنے وسائل کی کمی اور لوگوں کے مقابلے میں اپنی کمزوری اور بے بسی کو فریاد تجھی سے کرتا ہوں اے ارحم الراحمین تو ناتوانوں اور بے کسوں کا پروردگار ہے اور میرا مالک ہے۔

تو ہی ہے، آخر تو مجھے کس کے حوالے کرنے والا ہے؟ کیا اس حریف بیگانہ کے جو مجھ سے ترشروئی روا رکھتا ہے یا ایسے دشمن کے جو میرے معاملے پر قابو رکھتا ہے لیکن اگر مجھ پر تیرا غضب نہیں ہے تو پھر مجھے کچھ پروا نہیں پس تیری عافیت میرے لئے زیادہ وسعت رکھتی ہے میں اس بات کے مقابلے میں کہ تیرا غضب مجھ پر پڑے یا تیرا عذاب مجھ پر نازل ہو تیرے ہی نور و جمال کی پناہ طلب کرتا ہوں جس سے ساری تاریکیاں روشن ہو جاتی ہیں اور جس کے ذریعے دین و دنیا کے جملہ معاملات سنور جاتے ہیں مجھے تو تیری رضامندی اور خوشنودی کی طلب ہے بجز تیرے کہیں سے کوئی قوت وطاقت نہیں مل سکتی۔

مومن کی زندگی حسرتناک نہیں ہوتی:۔

اضطراب اور بے چینی کی ایک وجہ ماضی کے واقعات کا غم، حال کی خاک میں ملتی امنگیں اور مستقبل کے خطرات کا احساس ہے بعض لوگ ماضی کے حادثات پر سالوں کف افسوس ملتے ہیں آہیں بھرتے اور نالہ و فریاد کرتے ہیں۔ نتیجۃً یاد ماضی کا عذاب ان کے حال پر بھی اثر انداز ہوتا

ہے اور ان کی ہر لحظہ گزرنے والی زندگی کو تلخ بنا دیتا ہے پھر بالکل فطری طور پر ان حسرتوں اور تلخیوں کا سلسلہ دراز ہوتا چلا جاتا ہے اور اس کے ڈانڈے مستقبل سے جا ملتے ہیں اس طرح ان کی پوری بساط حیات پہ مایوسیوں کے گہرے اور تاریک سائے پڑنے لگتے ہیں اور ایک دائمی حسرت وافسوس ان پر مسلط ہو جاتا ہے۔

زندگی کی تباہی کا یہ عمل اس وقت شروع ہوتا ہے جب انسان کی سوچ کا یہ انداز یہ ہو کہ اگر میں یوں کرتا تو ایسا نہ ہوتا۔ اگر میں تندرست ہوتا تو آج اس انجام سے بچ جاتا ہے ہائے میرا فلاں عزیز نہ مرتا کاش اس وقت مجھے فلاں بات سوجھ جاتی یہ کاش اور اگر اور ہائے دنیائے حسرت کی وہ پرچھائیاں ہیں جو ہر مادہ پرست پر ہر وقت پڑتی رہتی ہیں اور اسے ایک اضطراب مسلسل سے دوچار رکھتی ہیں۔

اس کے برعکس مومن اپنی کتاب ماضی کی ورق گردانی اس طرح کبھی نہیں کرتا کہ اسے پچھتاوا لگ جائے نہ مستقبل کے موہوم وساوس و خدشات کو اس کی حوصلہ شکنی کی جرات ہوتی ہے وہ حال کی رنگینیوں اور سنگینیوں میں سے گزرتے ہوئے اپنی نظر سے اس حقیقت کو کبھی اوجھل نہیں ہونے دیتا کہ۔

مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِيْ كِتَابٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا ط اِنَّ ذَالِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ. لِّكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰى مَافَاتَكُمْ وَ لَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰكُمْ ط وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ. (الحدید: ۲۲. ۲۳)

کوئی مصیبت ایسی نہیں جو زمین میں یا تمہارے اپنے نفس پر نازل ہوتی ہو اور ہم نے اس کو پیدا کرنے سے پہلے ایک کتاب میں نہ لکھ رکھا ہو ایسا کرنا اللہ کیلئے بہت آسان ہے (یہ سب کچھ اس لئے ہے) تا کہ جو بھی نقصان تمہیں ہو اس پر تم دل شکستہ نہ ہو اور جو کچھ اللہ تمہیں عطا فرمائے اس پر پھول نہ جاؤ۔ اللہ ایسے لوگوں کو پسند نہیں کرتا جو اپنے آپ کو بڑی چیز سمجھتے ہیں اور فخر جتاتے ہیں۔

اس تعلیم کے بعد بندہ مومن جس شعار کو اپناتا ہے وہ ہے الحمد للہ علیٰ کلِ حال۔ اور درد کی چوٹ پر جس کلمہ کا سہارا لیتا ہے وہ ہے۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْن اور آنے والے خطرات کی عمارت مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ کی ضرب محکم سے پیوند خاک کر دیتا ہے حاصل کلام یہ کہ نعمت ایمان سے بہرور انسان حسرت وافسوس کا کبھی شکار نہیں ہوتا۔

ایمان اور رضا

اللہ بزرگ و برتر نے ازروئے انصاف خوشی کو رضا و یقین میں رکھا ہے اور غم و حزن کو غیظ و تشکک میں......(حدیث پاک ؐ)

عالم مادی میں اللہ تعالیٰ نے جس طرح بھوک اور پیاس کو مٹانے کیلئے اکل و شرب کا انتظام فرمایا ہے اسی طرح روحانی احساسات کی تسکین کیلئے رضا اور ایقان کے حصول کا طریقہ بتایا ہے۔ اپنی ذات اور اپنے رب سے راضی انسان ہی اپنے ماضی و حال سے مطمئن اور مسرور ہوتا ہے اور اللہ کے عدل و انصاف اور آخرت کی جزا و سزا کا یقین ہی اسے درخشاں مستقبل کا اطمینان دلاتا ہے اور نتیجۃً حقیقی سکون عطا کرتا ہے اس کے مقابلے میں ایمان و ایقان سے محروم لوگ کبھی بھی حقیقی شادمانی حاصل نہیں کر سکتے۔ ان کی زندگی تلخ اور تاریک ہوتی ہے۔ وہ مسلسل غم پیہم مصیبت اور ہمیشہ تنگدلی میں مبتلا رہتے ہیں۔ اپنے آپ سے بیزار، اپنے ابنائے نوع سے ناراض اور دنیا کی ہر چیز کے خلاف نفرت کے جذبات پال کر دہ اس عالم فراخ کو اپنے لیے سوئی کے ناکے کی طرح تنگ اور محدود کر لیتے ہیں جس میں جینا ایک عذاب سے کم نہیں ہوتا۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ بندۂ مومن بھی کبھی غم و حزن کا شکار ہو جاتا ہے۔ لیکن اول تو اسے غم جاں نہیں غم جہاں ہوتا ہے غم دنیا نہیں غم آخرت ہوتا ہے اور کبھی غم جاں اسے دامنگیر بھی ہو تو اس کا اثر بالکل عارضی ہوتا ہے اس لکئہ ابر کی مانند جو وسعت افلاک میں نمودار ہو اور ایمان کی باد تند و تیز اسے اڑا لے جائے۔

حقیقت رضا کا شعور ان اسباب میں سے ایک ہے جو انسان کو ابدی سعادت سے ہمکنار کرتے ہیں۔ رسول اللہ ؐ نے اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

من سعادة المرٔ استخارة ربه ورضاه بما قضٰی ومن شفاء المرء تركه الاستخارة وعدم ورضاه بعد القضا.

اپنے رب سے استخارہ (طلب خیر) کرنے اور اس کے فیصلہ پہ راضی ہو جانے والا انسان بڑا سعادت مند ہے اور بڑا بد بخت ہے وہ شخص جو خدا سے نہ بھلائی طلب کرے اور نہ اسکے فیصلہ پر راضی ہو۔

یہی وجہ ہے کہ مومن ہر کام میں ہاتھ ڈالنے سے قبل اللہ تعالیٰ سے بھلائی کا طلب گار ہوتا ہے وہ دعا کرتا ہے۔

اَللّٰھم اِن کُنت تعلم ان ھٰذا الامر خیر لی نی دینی ومعاشی وعاقبة امری فیسّره لِی وبارک لی فیه وان کنت تعلم انّ ھٰذا الامر شرلی فِی دینی معاشی وعاقبة امری فاصرفه عنی و اصرفنی عنده واقدارلی الخیر حیث کان ثم ارضنی به.

اے اللہ اگر تو اس کام کو میرے دین و دنیا کیلئے اور انجام کار کے طور پر میرے لئے بہتر سمجھتا ہے تو اسے مجھ پر آسان کر دے اور اس میں مجھے برکت دے اور اگر تو اس کام کو بلحاظ دین اور بلحاظ انجام میرے لئے برا خیال فرماتا ہے تو اسے میری نظروں سے ہٹا دے اور مجھے اس کام سے باز رکھ اور میرے لئے خیر کو مقدر فرما جہاں بھی ہو اور اس خیر مقدر کے ساتھ مجھے راضی کر دے۔

چنانچہ مومن اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر......خواہ وہ اچھی ہو یا بری...... ہر حال میں راضی رہتا ہے اور صبر و رضا کی یہ صفت اس کے دل کو کشادہ اور سینے کو فراخ کر دیتی ہے۔ وہ نہ کبھی مغموم ہوتا ہے نہ تنگدل نہ اسے اپنے آپ پر غصہ آتا ہے نہ اس کائنات پر، نہ زندگی سے بہرہ ور مخلوقات پر۔ اس کے برعکس وہ اپنی ذات اپنے گرد و پیش اور جملہ موجودات سے راضی اور خوش رہتا ہے کیوں کہ مسرت و رضا کا سرچشمہ اس کے ہاتھ لگ چکا ہوتا ہے اور وہ ہے اللہ رب العلمین پر غیر متزلزل ایمان۔

رضا ایک بہت بڑی روحانی نعمت ہے جس سے اللہ کے منکر یا اس کی ہستی اور اس کی جزاء میں شک کرنے والے محروم ہیں اس نعمت کو وہی حاصل کر سکتا ہے جس کا اللہ پر ایمان مضبوط ہو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ؐ پاک کو صبر و استقامت کے ساتھ اپنی حمد و ثناء اور بندگی و عبادت کرتے رہنے کی تلقین کی اور فرمایا لَعَلَّکَ تَرضٰی یعنی اس عمل ایمانی کے نتیجے میں) ہو سکتا ہے کہ آپ نعمت رضا کو پا لیں خود رسول اللہ ؐ کا ارشاد ہے۔

ذاق طعم الایمان من رضی بالله ربّاً وبالاسلام دیناً وَبمُحمّد رسولاً. (رواه احمد، ومسلم والترمزی)

جو شخص اللہ کے رب ہونے پر اسلام کے دین ہونے پر اور محمد ؐ کے رسول ؐ ہونے پر راضی ہو گیا اس نے حلاوتِ ایمان کو چکھ لیا۔

قرآن پاک میں صحابہ کرام ؓ کی سبقت ایمانی اور صداقت ایمانی کی شہادت دینے کے بعد

ہی اللہ تعالیٰ نے انہیں '' رَضِیَ اللّٰہُ عَنۡھُمۡ وَرَضُوۡا عَنۡہُ '' کا عظیم اعزاز عطا فرمایا ہے پس معلوم ہوا کہ مقام رضا پر فائز ہونے کیلئے دولت ایمان ناگزیر ہے۔

۱۔ مومن اپنی ذات اور اپنے رب سے راضی ہوتا ہے:۔

اپنی ذات سے راضی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے وجود اور شخصیت اور کائنات میں اپنے مرتبہ ومقام سے راضی ہے کیونکہ اسے معلوم ہے کہ وہ کوئی مہمل ہستی یا ناقص وحقیر چیز نہیں بلکہ خالق کائنات کی صفت صنعت گری کا شاہکار ہونے کی وجہ سے ایسی باشرف مخلوق ہے جو زمین پہ خدا کی خلافت کے منصب جلیل پر فائز ہے۔

علاوہ ازیں مومن اپنے رب سے بھی راضی ہوتا ہے اس لئے کہ وہ اس کی صفات کمال وجمال پہ ایمان کامل اور اس کے عدل اور رحم کا یقین رکھتا ہے اور اس کے علم وحکمت کی طرف سے بھی پوری طرح مطمئن ہوتا ہے نیز وہ سمجھتا ہے کہ اللہ کا بے پایاں فضل اور اس کے بے شمار احسانات اس پر ہیں بقول سیدنا ابراہیم علیٰ نبینا وعلیہ السلام:۔

اَلَّذِیۡ خَلَقَنِیۡ فَھُوَ یَھۡدِیۡنِ. وَالَّذِیۡ ھُوَ یُطۡعِمُنِیۡ وَیَسۡقِیۡنِ. وَاِذَا مَرِضۡتُ فَھُوَ یَشۡفِیۡنِ. وَالَّذِیۡ یُمِیۡتُنِیۡ ثُمَّ یُحۡیِیۡنِ. وَالَّذِیۡ اَطۡمَعُ اَنۡ یَّغۡفِرَ لِیۡ خَطِیۡٓئَتِیۡ یَوۡمَ الدِّیۡنِ. (الشعرا:۷۷:۸۲)

'' میرا رب وہ ہے جس نے مجھے پیدا کیا پھر وہی میری رہنمائی فرماتا ہے جو مجھے کھلاتا پلاتا ہے اور جب بیمار ہو جاتا ہوں تو وہی مجھے شفا دیتا ہے جو مجھے موت دیگا اور پھر دوبارہ مجھ کو زندگی بخشے گا اور جس سے میں امید رکھتا ہوں کہ جزا کے دن وہ میری خطا معاف فرمادیگا۔

غرض مومن اپنے حق میں اللہ کی تدبیر کو اپنی تدبیر سے بہت بہتر قرار دیتا ہے وہ اس کے ہر کام کو سراسر رحمت اور سراپا خیر سمجھتا ہے اور اگر اسے خدا کی خدائی میں کہیں کوئی کجی نظر آئے تو اسے بھی وہ کجی پر محمول نہیں کرتا بلکہ تکمیل خیر کا سامان یا اثبات خیر کیلئے شرط لازم گردانتا ہے مصیبت وتکلیف بلاشبہ شر ہے لیکن اس کے بغیر صبر کا دامن خیر بھی تو ہاتھ نہیں آتا اسی طرح اگر فقر وافلاس میں ایک صورت شر موجود ہے تو انفاق فی سبیل اللہ اور سخاوت وکرم جیسی خیرات وحسنات کے امتیازات بھی اسی کے وجود سے نمایاں ہوتے ہیں۔ لہٰذا اپنی ذات اور اپنے رب کی صفات میں کوئی چیز ایسی نہیں جو ایک بندۂ مومن کو ناراض کرنیوالی ہو۔

۲۔ مومن حیات وکائنات سے بھی راضی ہوتا ہے:۔

مومن یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ عالم موجودات اللہ تعالیٰ کی تخلیق ہے اور اس کا ذرّہ ذرّہ اللہ کی بے مثال حکمت ودانائی پر دلالت کرتا ہے۔ اس کے ہمہ گیر رحم وکرم کا مظہر ہے اور اس کے لامحدود علم وقدرت کا شاہکار ہے اسے اس عظیم کائنات کی تدبیر وانتظام میں کہیں کوئی خرابی اور خلل نظر نہیں آتا۔ وہ انسانوں اور دوسری مخلوقات کو دیکھتا ہے تو ان کے رزق کی تقسیم ان کا غم وانبساط ان کی عاجزی ودرماندگی اور ان کی قدرت وتوانائی کسی چیز میں بھی اسے کہیں عدل سے انحراف اور ظلم کا شائبہ تک محسوس نہیں ہوتا۔ بلکہ حق اور سراسر حق ہی مشاہدے میں آتا ہے ظاہر ہے کہ حیات وموجودات کے اس پرحکمت متوازن اور مبنی برعدل نظام سے ایک ایماندار کو راضی ہونا ہی چاہیے۔

۳۔ مومن انعامات خداوندی کا گہرا احساس رکھتا ہے:۔

اپنے آپ سے بیزار رہنے اور زندگی کا گلہ شکوہ کرنے والے لوگ بالعموم وہ ہوتے ہیں جو موجودہ انعامات الٰہی کا احساس نہیں رکھتے۔ وہ یہ تو کہتے ہیں کہ ہمارے پاس فلاں شے نہیں ہمیں وہ اور وہ چیز چاہیے لیکن انہیں اظہار شکر کرتے کبھی نہیں سنا گیا کہ یہ اور یہ نعمتیں ہمیں حاصل ہیں اس کے برعکس مومن اللہ کے عظیم احسانات کے احساس سے ہر وقت سرشار رہتا ہے وہ اس بات کا گہرا شعور رکھتا ہے کہ اللہ نے اسے نسل انسانی کے ایک فرد کی حیثیت سے تخلیق کیا علم وادراک اور غور وفکر کی صلاحیتیں عطا کیں، نطق وبیان اور سماعت وبصارت سے نوازا اسے دست وپا دیئے اور ان میں فعل وعمل کی قوت واستعداد پیدا کی اس کے پہلو میں دل پیوست کیا اور اسے اخوت ومحبت رحم وشفقت اور ایثار وقربانی کے جذبات سے معمور کیا۔ اس کے تن وشکم کی ضروریات کیلئے زمین نے رزق کے خزانے اگلے اور آسمان سے وحی الٰہی کے ذریعے اس کی فطری امنگوں اور روحانی تقاضوں کو پورا کیا گیا۔ وہ جب غور کرتا ہے تو اپنی ذات میں بے شمار انعامات موجود پاتا ہے حتیٰ کہ انفس وآفاق اسے جلی وخفی نعمتوں سے مملو نظر آتے ہیں جن سے وہ براہ راست یا بالواسطہ استمتاع کر رہا ہوتا ہے۔ '' وَاِنۡ تَعُدُّوۡا نِعۡمَةَ اللّٰہِ لَاتُحۡصُوۡھَا '' یہی وجہ ہے کہ نبی اکرمؐ جو انعام الٰہی کا سب سے زیادہ شعور رکھتے تھے، اٹھتے بیٹھتے اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کرتے رہتے اور جذبات تشکر

وسپاس کا اظہار کرتے نہ تھکتے تھے مقصود یہ تعلیم دینا تھا کہ بندوں پہ رحمت حق کی فراوانی صرف اس بات کا ہی تقاضا نہیں کرتی کہ وہ اس کا کبھی شکوہ نہ کریں اور ہمیشہ راضی رہیں بلکہ اس بات کا بھی تقاضا کرتی ہے کہ وہ رب العزت کی تحمید وتوصیف میں ہر آن رطب اللسان رہیں۔

۴۔ مومن اللہ کی تقدیر پر راضی ہوتا ہے:۔

مومن جو اپنے آپ کو ہر وقت انعامات الٰہی کے بوجھ تلے دبا ہوا محسوس کرتا ہے۔ اللہ کی مشیت اور تقدیر...... خواہ اچھی ہو یا بری پر بھی راضی رہتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس بات پر ایمان رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی کام عبث، لایعنی اور خلاف حکمت نہیں ہوتا اللہ تعالیٰ خواہ مخواہ اپنے بندوں کو مصیبت میں مبتلا نہیں کرتا ایک مومن صادق کی نظر میں رب العزت اپنے بندوں کیلئے والدین سے بھی زیادہ رحیم وشفیق ہوتا ہے اس کی رحمت اس کے قہر وغضب اس کے مواخذہ واحتساب بلکہ ہر چیز پر حاوی ہے پھر کس طرح ممکن ہے کہ وہ اپنی مخلوقات میں سے کسی کے ساتھ ظلم کا ارادہ کرے؟ اس کا کوئی فیصلہ بظاہر ظلم بھی نظر آئے تو مومن اسے بھی خیر اور رحمت ہی پر محمول کرتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔

فَعَسَىٰ أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَيَجْعَلَ اللَّهُ فِيهِ خَيْرًا كَثِيرًا۔ (النساء: ۱۹)

"تو ہو سکتا ہے کہ تم ایک چیز کو ناپسند کرو اور اللہ نے اسی میں (تمہارے لئے) خیر کثیر رکھ دی ہو"۔

اہل ایمان کا یہی وہ عقیدہ رضا بالقضاء ہے جس کے خوشگوار اثرات کو مسلم معاشرہ میں رہنے والے بہت سے اہل مغرب نے بھی محسوس کیا ہے انہی میں سے ایک مغربی اہل قلم "ف،س، بوڈلے" "میں نے اللہ کی جنت میں زندگی بسر کی" کے زیر عنوان لکھتا ہے۔

1918ء میں میں اپنے ماحول کو چھوڑ کر شمال مغربی افریقہ چلا گیا۔ وہاں میں نے بدوؤں کے درمیان صحرا میں سات برس گزارے میں ان کی زبان سیکھتا ان جیسا لباس زیب تن کرتا ان کیساتھ کھاتا پیتا اور ان کے سے ہی معمولات زندگی اختیار کرتا تھا۔ اس عرصے میں میں نے اسلام کا گہرا مطالعہ کیا اور محمدؐ کے بارے میں ایک کتاب تالیف کی جس کا نام "الرسول" ہے۔ وہ سال جو میں نے ان خانہ بدوش عربوں میں بسر کئے میری زندگی کے بہترین سال تھے اور امن وسکون اور لذت حیات سے بھرپور بھی۔

میں نے ان صحرا نشینوں میں رہ کر محسوس کیا کہ یہ لوگ انتہائی قلق واضطراب میں بھی پر سکون رہتے ہیں میرے نزدیک اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس بات کا مضبوط اعتقاد رکھتے ہیں کہ جو کچھ مقدر ہے ہو کر رہے گا اسے کوئی نہیں روک سکتا اور کسی شخص کو وہی دکھ پہنچتا ہے جو اس کیلئے لکھ دیا گیا ہے لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ وہ نزول بلا کے وقت ایک دوسرے پر تکیہ کر کے بیٹھ رہتے اور ہاتھ پاؤں باندھ کر مصیبت پہ مصیبت سہتے چلے جاتے ہیں نہیں ہرگز نہیں ایک واقعہ سنیئے۔

ایک دن جھلسا دینے والی تیز ہوا چلی، وہ اتنی شدید تھی کہ صحرا کی بے شمار ریت اٹھائے ہوئے بحر ابیض متوسط عبور کر گئی اور اسے فرانس کی وادی الرون می جا پھینکا۔ سخت گرمی کی وجہ سے مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے سر کے بال جڑوں سے اکھاڑے جا رہے ہوں غرضیکہ یہ مصیبت میرے لئے اتنی ناقابل برداشت تھی کہ میں پاگل ہوا جا رہا تھا لیکن عربوں کی زبان پہ ایک حرف شکایت تک نہ آیا۔ زیادہ سے زیادہ انہوں نے جو کچھ کہا۔ وہ تھا "قضاء مکتوب" یعنی طے شدہ فیصلہ وہ ایسے موقع پر زیادہ سرگرمی سے کام کرتے ہیں چنانچہ انہوں نے مہلک لو چلنے سے پہلے ہی اپنی بھیڑ بکریوں کے بچے ذبح کر دیئے۔ پھر ڈھور ڈنگر لے کر جنوب کی طرف پانی کے کنارے چلے گے۔ اور کوچ کا یہ انتہائی تکلیف دہ کام انہوں نے کمال صبر وسکون اور خاموشی کے ساتھ انجام دیا ان کے قبیلے کے سردار نے کہا تو یہ کہ "ہمارا کچھ زیادہ نقصان نہیں ہوا ہم تو سب کچھ کھو کر بھی صبر کرنے کے عادی ہیں اللہ کا شکر ہے کہ اب کے ہمارے مویشی تقریباً چالیس فی صد زندہ بچ رہے ہیں انہی سے ہم نئے سرے سے کام کا آغاز کر سکتے ہیں"۔

۵۔ مومن اللہ کے عطا کردہ رزق پر راضی ہوتا ہے:۔

مومن اللہ کی تقسیم رزق اور اس کے مواہب وعطایا پر...... خواہ قلیل ہوں یا کثیر راضی رہتا ہے اس لئے کہ اولاً وہ اپنے پاس موجود ہر نعمت کو سراسر اللہ کی رحمت اور اس کا فضل تصور کرتا ہے۔ ثانیاً اللہ تعالیٰ کو عادل اور حکیم سمجھتا ہے ان بنیادی حقائق کو ذہن نشین کرنے کے بعد اسے مال ودولت دنیا کے بارے میں اللہ سے کبھی کوئی شکایت پیدا نہیں ہوتی۔ وہ رزق حلال کیلئے پوری کوشش کرتا ہے اور اس کوشش کے نتیجے میں جو کچھ حاصل ہوا اس پر قانع ہو جاتا ہے اور اپنے سے زیادہ آسودہ وخوشحال لوگوں کی حالت پہ جلتا نہیں بلکہ اپنے نتائج محنت کو صبر وشکر کے ساتھ قبول کر

لیتا ہے یہی مفہوم ہے قناعت کا لیکن بعض لوگوں نے تو لفظ قناعت پہ ظلم ہی کر دیا ہے ان کے خیال میں آدمی کمزوری وبہمتی کی زندگی بسر کرے، ترقی وسربلندی کی خواہش کو یکسر پامال کر کے رکھ دے اور بھوک افلاس اور محرومی ہی کو پسند کرنے لگے تو پھر وہ رضا وقناعت کی صفت سے متصف ہوتا ہے حالانکہ رضا کا یہ مقصود ہے اور نہ قناعت ہی کی یہ صحیح تعبیر ہے۔

اس سلسلہ میں دو باتوں کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے...... یہ حقیقت ہے ہے انسان کے دل میں محبت دنیا کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے اور وہ مال ودولت کی شدید حرص رکھتا ہے حدیث نبویؐ ہے:

لو کان الابن أدم وادیان من ذھب لاتبغٰی ثالثًا ولا یملأ عین ابن ادم الا التراب.

اگر ابن آدم کو سونے سے معمور دو وادیاں بھی مل جائیں تو (اس کی حرص ختم نہیں ہوگی) بلکہ وہ ایسی ہی کسی تیسری وادی کی تلاش میں رہے گا۔ اس کی آنکھ کو تو (قبر کی) مٹی ہی بھر سکتی ہے۔

انسان کی اس انتہا پسند فطرت کو معتدل اور متوازن بنانے کی ضرورت تھی چنانچہ تعلیمات اسلام نے اس فرض کو بحسن وخوبی انجام دیا اور ہوس کی آگ کو بہت کچھ ٹھنڈا کیا رسول اللہؐ نے فرمایا:

یا ایھا الناس اتقو اللّٰہ واجملو افی الطب فان نفسألن تموت حتٰی تستوفی رزق، وان ابطأ عنھا، فاتقوا اللّٰہ و اجھلو افِی الطلب، خذُوا ماحل دعوا ماحرم.

اے لوگو اللہ سے ڈرو اور مال ودولت دنیا کی تحصیل میں حسن طلب کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑو (تمہیں معلوم ہونا چاہیے) کہ کسی شخص کو اس وقت تک موت نہیں آتی جب تک وہ اپنے حصہ کا رزق پورا پورا حاصل نہ کر لے۔ اگر طے شدہ رزق کے حصول میں تاخیر ہو رہی ہو تو اپنے اندر خوف خدا پیدا کرو اور حسن طلب سے کام لو جو کچھ حلال ملے اسے لے لو اور حرام سامنے آئے تو اسے چھوڑ دو۔"

ایک اور مقام پہ فرمایا:

لیس الغنیٰ عن کثرۃ العرض انما الغنیٰ غنِی النَّفْسِ (متفق علیہ)

غنا مال واسباب کی زیادتی کا نام نہیں بلکہ یہ دل کی تونگری کا نام ہے۔

پس قناعت جو مطلوب اور محمود ہے یہ ہے کہ آدمی رزق حلال کیلئے سعی کرے اور جو کچھ پاکیزہ وطیب ملے اسے صبر وشکر سے قبول کرے۔ البتہ حرام سے پرہیز کرے چاہے وہ کتنا ہی ارزاں اور فراواں کیوں نہ ہو اس کے ساتھ ساتھ مؤخر الذکر ارشاد رسولؐ اور بہت سی دیگر نصوص قرآن وسنت ایک اور چیز کی طرف بھی اشارہ کرتی ہیں اور وہ یہ ہے کہ خوب سے خوب تر اور زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کی خواہش کا رخ دنیا کی ناپائیدار چیزوں سے ہٹا کر عقبیٰ کی لازوال نعمتوں کی طرف پھیرنا چاہیے۔ نفس کی بُری اور ناپسندیدہ عادات کو تقویت دینے کے بجائے بندۂ مومن کیلئے ضروری ہے کہ ایثار وقربانی اور بذل وانفاق جیسی ارفع واعلیٰ صفات کو اپنے اندر پیدا کرے قناعت کا یہ پہلا مفہوم ہے۔

دوسری بات جسے قناعت کے ضمن میں سمجھنے کی ضرورت ہے یہ ہے کہ دنیا میں بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو بعض لوگوں کو تو بغیر کسی کوشش کے مل جاتی ہیں مگر بعض دوسرے حضرات کو نہیں ملتیں اور وہ کوشش بھی کریں تو نہیں مل سکتیں۔ مثلاً خوبصورت اور نوجوان ہونا، بلند قامت اور صحت مند ہونا، بے غم ہونا یا کثیر الاولاد ہونا اب اگر کوئی بدصورت یہ کوشش کرے کہ وہ حسن وجمال کا پیکر بن جائے تو یہ ناممکن ہے کوئی پیر فرتوت عہد شباب کو لوٹانا چاہے تو ظاہر بات ہے اسے ناکامی ہوگی کسی کوتاہ قد کا یہ ارمان کہ وہ بلند قامت ہو جائے، کبھی پورا نہیں ہو سکتا اسی طرح پے درپے غموں اور صدموں سے نڈھال انسان ہشاش بشاش رہنا چاہے، یا کوئی ثمر زندگی سے محروم عمر کے آخری حصے میں فرزند ارجمند کا منہ دیکھنا چاہے تو شاید ان حضرات کی آرزوئیں بھی پوری نہیں ہو سکتیں ایسے لوگوں کو ایمان باللہ بتاتا ہے کہ غنا وسعادت اس چیز کا نام نہیں کہ آدمی اپنی جملہ خواہشات کی تکمیل میں کامیاب رہے بلکہ غنا وسعادت کا راز خدا کی تقسیم اور تقدیر پر راضی رہنے میں مضمر ہے۔ ارشاد رسولؐ ہے۔

اِرْضِ بما قَسَمَ اللّٰہُ لَکَ تکن اَغنی النَّاس. مَاقَلَّو کفیٰ خَیرٌ مِمَّا کَثُرَوَاَلْھٰی.

جو کچھ اللہ تعالیٰ نے تیری قسمت میں لکھا ہے اس پر راضی ہو جا تو تمام لوگوں سے زیادہ غنی ہو جائے گا۔
قلیل اور کفایت کرنے والی نعمتیں بہت بہتر ہیں کثیر مگر غافل کر دینے والے انعامات سے۔

دین کی ان تعلیمات کی بدولت محروم لوگ اپنی تلخ اور ناگوار زندگی کو بھی گوارا بنا لیتے ہیں اور

پھران کانفس کبھی ناممکنات اورمحالات کی طلب کے درپے نہیں رہتا۔ یہ قناعت کا دوسرا مفہوم ہے۔

اِنَّ الغَنِیَّ هُوَالغَنِیُّ بِنَفْسِہٖ ولوانه عاری المَناکِ کِبِ حاف
مـا کُلُّ مـا فَوْقَ الْبَسِیْطَةِ کـافِیاً واذا قنعت فبعض شیئی کاف

(ترجمہ) غنی وہی ہے جو دل کا غنی ہو اگرچہ اس کا دوش بےلباس اور پابرہنہ ہوں روئے زمین پہ جو کچھ بھی ہے اگر سارے کا سارا تجھے مل جائے تو کافی نہ ہو لیکن اگر تو قانع ہو جائے تو معمولی چیز بھی تجھے کفایت کرسکتی ہے۔

ایک نوجوان کا قصہ:۔

رسول اللہؐ کے پاس تیرہ افراد پر مشتمل ایک یمنی وفد آیا آپؐ اس کی آمد سے بہت خوش ہوئے اور وفد کے ارکان کی خوب عزت وتکریم کی۔ دوران قیام انہوں نے مختلف امور کے متعلق استفسار کیا اور علم دین حاصل کرتے رہے یہ لوگ آپ کے پاس زیادہ عرصہ نہیں ٹھہرے ان کی خواہش تھی کہ جلد از جلد واپس جائیں اور اپنے اہل وطن کو رسول اللہ کی تعلیمات سے آگاہ کریں چنانچہ چند دن ٹھہرنے کے بعد وہ رخصت ہوتے وقت آپ کے پاس آئے تو آپؐ نے حضرت بلالؓ کو بھیجا تا کہ انہیں عام وفود سے بہتر ہدایا وتحائف پیش کریں۔ جب وہ تحائف وصول کر چکے تو آپ نے فرمایا تمہارا کوئی ساتھی محروم تو نہیں رہا؟ انہوں نے جواب دیا کہ ایک لڑکا ہے جسے ہم اپنے سامان کے پاس پیچھے چھوڑ آئے ہیں آپؐ نے فرمایا اسے بھی ہمارے پاس بھیج دینا واپس جا کر انہوں نے لڑکے سے کہا کہ رسول اللہؐ کے پاس جاؤ اور اپنی کوئی حاجت ہے تو پوری کرالو۔ لڑکا آپ کے پاس حاضر ہوا اور عرض کرنے لگا ''یارسول اللہؐ میں بنی ابذی کا فرد ہوں اور اس وفد کے ساتھ یہاں آیا تھا جو ابھی آپؐ کے پاس حاضر ہوا تھا۔ آپؐ نے ان کی حاجات تو پوری کر دی ہیں ایک میری حاجت بھی پوری کر دیجئے۔ آپؐ نے دریافت فرمایا تیری حاجت کیا ہے؟ لڑکا بولا میری حاجت میرے ساتھیوں جیسی نہیں وہ لوگ آئے تو اسلام کیلئے تھے لیکن دنیا کا مال ومتاع لیکر گئے ہیں میں واللہ صرف اس لئے آیا تھا کہ آپؐ میرے حق میں اللہ سے یہ دعا کریں کہ وہ میری مغفرت فرمائے۔ مجھ پر رحم کرے اور میرے دل کو غنی بنادے۔ آپؐ نے اسی وقت لڑکے کی طرف رخ پھیرا اور دست دعا اٹھا دیئے:

''اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لَه' وَارْحَمْهُ وَاجْعَلْ غِنَاهُ فِی قَلْبِه.''

پھر اس لڑکے کو بھی ویسے ہی تحائف عطا کرنے کا حکم دیا جیسے اس کے ساتھیوں کو دیئے جا چکے تھے اور اس کے بعد یہ حضرات خوشی خوشی یمن روانہ ہو گئے۔

اس واقعہ کو کافی عرصہ بیت گیا۔ حجۃ الوداع کے موقع پر پھر یہی لوگ منیٰ میں رسول اللہؐ سے ملے اور اپنا تعارف کرایا۔ آنحضرت نے دریافت فرمایا اس لڑکے کا کیا حال ہے جو تمہارے ساتھ آیا تھا۔ کہنے لگے یا رسولؐ اس جیسا آدمی ہم نے کوئی نہیں دیکھا نہ اس سے زیادہ قناعت کرنے والا کوئی شخص ہمارے علم میں ہے اگر لوگ ساری دنیا کا مال ودولت بھی آپس میں بانٹ رہے ہوں تو وہ ان کی طرف بالکل التفات نہیں کرتا اس پر آپؐ نے فرمایا:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ اِنِّی لَا رْجُوْاَنْ یَّمُوْتَ جَمِیْعاً.

''مجھے پوری امید ہے کہ اس کی موت بھی عالم یکسوئی میں واقع ہوگی۔'' ان میں سے ایک صاحب نے پوچھا ''اے اللہ کے رسولؐ کیا ہر شخص یکسوئی کی حالت میں نہیں مرتا۔'' آپؐ نے وضاحت کرتے ہوئے فرمایا بعض لوگ پراگندگی فکر کے ساتھ مرتے ہیں۔ وہ بستر مرگ پہ پڑے ہوتے ہیں لیکن ان کی خواہشات ان کے افکار، ان کے پروگرام اور منصوبے انہیں نہ معلوم کہاں کہاں لئے پھرتے ہیں ایسے لوگ جو عالم نزع میں بھی یکسو نہیں ہوتے۔ اللہ کو ان کی کچھ پروا نہیں کہ وہ کس چیز کے غم میں اور کس حالت میں مر رہے ہیں۔'' یہ سن کر انہوں نے کہا مگر وہ نوجوان تو ہم میں بہترین زندگی بسر کر رہا ہے دنیا کی محبت اس کے دل میں مطلق نہیں اور اللہ کے دیئے ہوئے رزق پر پوری طرح قانع ہے۔

آنحضرتؐ کی وفات کے بعد ارتداد کا جو طوفان اٹھا اس کی رو میں بہت سے اہل یمن بھی بہ گئے اس موقع پر یہی نوجوان اپنی قوم کو خدا یاد دلاتا رہا اور انہیں اسلام کی حقانیت اور قدر وقیمت بتاتا رہا نتیجۃً اس کی قوم کا کوئی فرد مرتد نہ ہوا...... اس نوجوان کے قصے سے ہمیں کئی سبق ملتے ہیں۔

پہلا سبق تو یہ ہے کہ آدمی کو اس کے حصہ کا رزق مل کے رہتا ہے اہل وفد اسے پیچھے چھوڑ گئے تھے لیکن آپؐ نے استفسار کر کے اسے بلوایا اور تحائف دیئے۔ دوسرا سبق یہ ہے کہ

دولت اسلام کیلئے فکر مند شخص دولت دنیا سے محروم نہیں رہتا تیسرا سبق یہ ہے کہ اللہ سے رحم ومغفرت اور غنائے نفس کا طلبگار بارگاہ خدا اور رسولؐ میں ایک مقام خاص کا حقدار بن جاتا ہے جو دوسرے لوگوں کو نصیب نہیں ہوتا۔ دیکھیئے کئی سالوں کے بعد جب اہل وفد سے دوبارہ ملاقات ہوئی تو آپؐ نے بطور خاص اس لڑکے کے حالات دریافت فرمائے ایک اور سبق جو سب سے اہم ہے یہ ہے کہ قناعت شعار آدمی کو زندگی میں یکسوئی حاصل ہوتی ہے اور موت کے وقت بھی اس کی توجہ صرف ایک ہی ذات پر مرتکز رہتی ہے۔

اِنَّ صَلٰوتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ. لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ.

۴۔ قناعت ورضا سرچشمۂ قوت ہے:۔

بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ غربت وقناعت کی وجہ سے انسان میں ضعف واضمحلال پیدا ہو جاتا ہے اور وہ معاشرہ میں اپنا مرتبہ ومقام کھو بیٹھتا ہے۔ ہماری رائے میں یہ خیال قلت فکر کا نتیجہ ہے ہم تو دیکھتے ہیں کہ جتنی خودداری اور عزت نفس اور اپنے موقف پر ڈٹ جانے کی طاقت قناعت شعار لوگوں میں پائی جاتی ہے اتنی مزاحمت کسی بڑے سے بڑے دولت منداور بااثر آدمی میں بھی موجود نہیں ہوتی۔ تاریخ کے صفحات بھی اسی حقیقت پہ شاہد ہیں کہ ظلم وجور کا مقابلہ کرنے والے، اپنے حقوق کیلئے لڑنے والے اور باجبروت حکمرانوں سے حق وصداقت کی بنیاد پر ٹکرا جانے والے لوگ بالعموم وہی ہوتے ہیں جنہیں دنیا کمزور اور بے وسیلہ سمجھتی ہے مگر جو تقدیر پہ شاکر اور مصیبت وابتلا پہ راضی رہنے والے لوگ ہوتے ہیں ایک قناعت شعار شخص امیروں کے محلات بادشاہوں کے خزانوں اور عیش وعشرت میں پلنے والے لوگوں کے ساز وسامان کو اسی نگاہ سے دیکھتا ہے جس طرح کہ بلند فضا میں اڑنے والا پرندہ پستی کی طرف دیکھتے ہوئے یہ محسوس کرتا ہے کہ رفیع الشان محلات ریت کے گھروندے ہیں انسان محض چیونٹیاں ہیں جو زمین پر رینگ رہی ہیں۔

سیدنا مسیح علی السلام کا فرمان ہے اون میرا لباس ہے نان جویں میرا طعام ہے اور چاند میرا چراغ ہے میرے پاؤں میری سواری ہیں اور میرا بازو میرا تکیہ ہے میں رات بسر کرتا

ہوں تو میرے پاس (ان چیزوں کے سوا) کچھ نہیں ہوتا۔ اور دن گزارتا ہوں تو اسی حال میں بایں ہمہ روئے زمین پہ مجھ سے زیادہ غنی اور بے نیاز کوئی نہیں امام غزالیؒ نے اپنی کتاب ''احیاء العلوم'' کے باب الامر بالمعروف والنہی عن المنکر میں ایک واقعہ نقل کیا ہے کہتے ہیں کہ صبر وقناعت کی زندگی بسر کرنے والا ایک بوڑھا راہ چلتے چلتے کوئی کھجور کی گٹھلی نظر آتی تو اسے اٹھا لیتا کہ یہی اس کا رات کا کھانا ہوتا تھا ایک دن اس بوڑھے کو ایک نوجوان ملا جس کے پاس ایک آلۂ موسیقی تھا۔ اس پہ ہارون الرشید کی لونڈی گایا کرتی تھی۔ بوڑھے نے اس آلہ کو توڑ دیا ہارون کو خبر پہنچی تو غضبناک ہوگیا اور بوڑھے کو بلا بھیجا۔ جب وہ ہارون کے پاس پہنچا تو اس نے کہا بڑے میاں آپ کو یہ کام کرنے پر کس چیز نے مجبور کیا۔ بوڑھے نے پوچھا کون سا کام؟ اب ہارون یہ تو نہ کہہ سکتا تھا کہ تو نے مغنیہ کا آلۂ موسیقی توڑ دیا ہے۔ وہ بار بار اپنا ہی سوال دہراتا چلا گیا بوڑھا خلیفہ کی کمزوری سمجھ گیا اور کہنے لگا۔ جناب آپ کے باپ دادا منبر رسولؐ پر خطبہ جمعہ کے دوران یہ آیت پڑھا کرتے تھے۔

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِیْتَآءِ ذِی الْقُرْبٰی وَیَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ وَالْبَغْیِ. (النحل: ۹۰)

سو حضور والا میں نے ایک برائی دیکھی اسے مٹا دیا اب آپ کو اعتراض کس چیز پر ہے؟ ہارون کو بھی کہنا پڑا کہ اسے تو مٹا ہی دینا چاہیے تھا واقعہ کا راوی کہتا ہے کہ اس کے بعد بوڑھا اٹھا اور نکل گیا ہارون نے اس کے پیچھے ایک آدمی کو دس ہزار درہم کی ایک تھیلی دے کر بھیجا کہ اگر بوڑھا لوگوں سے اس بات کا ذکر نہ کرے تو اسے تھیلی دے دینا۔ بصورت دیگر واپس لے آنا۔ چنانچہ وہ آدمی بوڑھے کے تعاقب میں نکلا تو اسے دیکھا کہ زمین میں دھنسی ہوئی ایک گٹھلی کو نکالنے کی کوشش کر رہا ہے اس نے اسے تھیلی کی پیشکش کی اور کہا۔ کہ امیر المومنین کی طرف سے اسے قبول فرمائیں۔ بوڑھے نے جواب دیا۔ خلیفہ سے کہو یہ رقم جہاں سے لی ہے وہیں لوٹا دے مجھے اس کی ضرورت نہیں'' اور دوبارہ گٹھلی کے ساتھ مشغول ہوگیا اور یہ اشعار گنگنانے لگا۔

ا اَرَی الدُّنیَا لِمَنْ هِیَ فِیْ یَدَیْهِ	هُمُوْ مَا کُلَّمَا کَثُرَتْ لَدَیْدِ
تُهِیْنُ الْمُکْرِمِیْنَ لَهَا بصُغْرٍ	وَتُکْرِمُ کُلَّ مَنْ هَانَتْ عَلَیْرِ
اِذَا اسْتَغْنَیْتَ عَنْ شَیْئٍ فَدَعْهُ	وَخُذْ مَا اَنْتَ مُحْتَاجٌ اِلَیْدِ

ترجمہ:۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ جس کے ہاتھ میں بہت زیادہ مال و دولت دنیا ہوا سے بکثرت غم و افکار لاحق رہتے ہیں اور جو لوگ دنیا کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں دنیا انہیں ذلیل کرتی ہے اور جو اسے ہیچ سمجھتے ہیں یہ انہیں معزز ٹھیراتی ہے جب تجھے ایک چیز کی ضرورت نہیں تو اسے حاصل کرنے کی فکر چھوڑ ہاں جس چیز کی تجھے حاجت ہے اسے لینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

معلوم ہوا کہ قناعت شعار لوگ ہی دراصل طاقتور ہوتے ہیں حق گوئی اور بے باکی سے کام لیتے ہیں اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دے سکتے ہیں۔ ان کی عزت نفس اور خودداری انہیں امراء وملوک سے بے نیاز کر دیتی ہے۔ اس وجہ سے عامتہ الناس بھی انہیں سر آنکھوں پہ بٹھاتے ہیں۔ یہ لوگ جور رضا و قناعت کے پیکر ہوتے ہیں کبھی کفر و باطل پہ سکوت اختیار نہیں کرتے۔ ان میں اتنی جرات ہوتی ہے کہ بڑے بڑے جابر سلاطین کے سامنے بھی کلمہ حق کہہ سکیں۔

*****

ا میں دیکھ رہا ہوں کہ جس کے ہاتھ میں بہت زیادہ مال و دولت دنیا ہو اُسے بکثرت غم و افکار لاحق رہتے ہیں اور جو لوگ دُنیا کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں دنیا انہیں ذلیل کرتی ہے اور جو اسے، ہیچ سمجھتے ہیں یہ انہیں معزز ٹھیراتی ہے۔ جب تجھے ایک چیز کی ضرورت نہیں تو اُسے حاصل کرنے کی فکر چھوڑ۔ ہاں جس چیز کی تجھے حاجت ہے اسے لینے میں کوئی مضائقہ نہیں

ایمان اور طمانیت قلب

اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں فرماتا ہے:

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ یَلْبِسُوْٓا اِیْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِکَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَ هُمْ مُّهْتَدُوْنَ.

"اہل ایمان جنہوں نے اپنے ایمان کو ظلم کے ساتھ آلودہ نہیں کیا انہی کیلئے حقیقی امن ہے اور وہی راہ راست پر ہیں۔"

امن کی یہ بشارت حیات دنیا کیلئے بھی ہے اور موت کے بعد کی ابدی اور لازوال زندگی کے لئے بھی جہاں تک اس دنیا کا تعلق ہے مومن کو نہ تو امور رفتہ کی یاد ستاتی ہے نہ وہ پرخطر حالات میں گھبراتا ہے اور نہ مستقبل کے اندیشہ ہائے موہوم اسے مضطرب کرتے ہیں۔ زمانہ کے تلخ و شیریں اور گرم و سرد حالات میں وہ کچھ اسطرح پرسکون رہتا ہے جیسے جنت میں پرسکون زندگی بسر کرنے والا بشر۔ طمانیت قلب کی یہ متاع عزیز کتنی گراں قدر چیز ہے اس کا اندازہ صرف وہ پریشان آدمی کرسکتا ہے جو ہر وقت خوف اور اضطراب کا شکار رہتا ہے۔ ایک دانا سے سوال کیا گیا سرور کیا ہے؟ اور خوشی کا راز کیا ہے؟ اس نے کہا "سکون" کیونکہ محروم سکون کے پاس زندگی کے ہزار سامان بھی موجود ہوں تو اس کی زندگی کوئی زندگی نہیں ہوتی۔

محروم ایمان کا اضطراب اور صاحب ایمان کا سکون:۔

میں ایک دائمی خوف میں مبتلا ہوں لوگوں کا خوف، اپنی ذات کا خوف اور دیگر اشیاء موجودات کا خوف، خوف مکمل طور پر میرا احاطہ کئے ہوئے ہے نہ دولت و ثروت مجھے سکون بخشتی ہے۔ نہ بلند منصب، نہ صحت، نہ عورت، نہ محبت، نہ تفریح طبع کے رنگارنگ پروگرام ہر چیز کو میں نے آزما دیکھا کوئی بھی تو میرے لئے سکون بخش ثابت نہ ہوئی۔ آخر یہ خوف مجھ پر کیوں مسلط ہے؟ کیا یہ آلام وافکار کا پیدا کردہ ہے؟ نہیں مجھے کوئی غم لاحق نہیں نہ کسی بات کی فکر ہے دنیا اور اسباب دنیا میں سے ہر چیز میرے پاس موجود ہے مال ہے عزت ہے تندرستی و توانائی ہے حسن و جمال ہے پھر خوف کس بات کا ہے؟ کیا اللہ کا خوف ہے؟ نہیں ایسا بھی نہیں۔ اللہ تو میری زندگی سے بالکل خارج ہے پھر خوف کس کا؟ کیا معاشرہ؟ لیکن اس کو تو میں سخت ناپسند کرتا ہوں اس سے

بیزار ہوں اور اس کا مذاق اڑاتا رہتا ہوں۔ تو کیا میں موت سے ڈرتا ہوں؟ مگر اسکی بھی مجھے پرواہ نہیں نہ اس کے بارے میں کبھی سوچا ہے۔ کبھی کبھی میں اس لئے بھی خوفزدہ رہتا ہوں کہ اب تو کوئی ایسی چیز نہیں جس کا خوف کھاؤں لیکن بعد میں کوئی صورت پیدا نہ ہو جائے اور کبھی اس بات کا خوف ہوتا ہے کہ اس وقت ہر نعمت میسر ہے پھر شاید رہے نہ رہے۔ ترقی کی انتہائی بلندیوں پر پہنچنے کے باوجود میں سکون سے محروم ہوں سب کچھ پا لینے کے بعد بھی میں بے چین ہوں معلوم حقیقتوں سے نہیں، نامعلوم اور مجہول امور سے خائف رہتا ہوں۔ میری بدنصیبی ملاحظہ ہو کہ میرے خوف وہراس، اور تشویش واضطراب کی بنیاد خود زندگی ہے۔'' یہ اس شخص کی قلبی کیفیت ہے جو ایمان سے محروم ہوتا ہے اس کے برعکس یہ بھی دیکھیے کہ صاحب ایمان کے روز وشب کیسے گزرتے ہیں۔

وہ عام حالات تو درکنار انتہائی خطرناک مواقع پر بھی پُرسکون رہتا ہے۔ رسول پاکؐ اور حضرت ابوبکرؓ غار ثور میں تھے اور کفار قریش ان کے تعاقب میں چاروں جانب بھاگ دوڑ کر رہے تھے۔ ڈھونڈ نکالنے والوں کیلئے بڑے بڑے انعامات تجویز کئے جا چکے تھے۔ اس عالم میں چند لوگ تلاش کرتے کرتے ٹھیک اسی غار کے اوپر پہنچ جاتے ہیں جس میں سرور کونینؐ اور جناب صدیقؓ موجود تھے۔ حضرت ابوبکرؓ نے عرض کی کہ یارسول اللہؐ اگر یہ لوگ اپنے پاؤں کی جانب دیکھیں تو ہم انہیں نظر آسکتے ہیں۔ رسول اللہؐ نے انتہائی پرسکون انداز میں فرمایا ''ابوبکر لاَ تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا۔'' گھبراؤ نہیں اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے تو ان کی والدہ محترمہ کا خیال تھا کہ بس اب چند ہی لمحوں کے بعد بچہ فرعون کے بے رحم جلاّدوں کی چھری کے نیچے ہوگا مگر فوراً ہی ان کے دل میں یہ بات ڈالی گئی کہ جب بچے کی جان کو خطرہ ہو تو اسے ایک صندوق میں ڈال کر دریا میں بہا دیا جائے۔ والدہ نے...... جی ہاں اس نومولود بچہ کی والدہ نے سب کام اپنے ہاتھ سے انجام دیئے کمال سکون کے ساتھ اور اس ایمان کی بدولت کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے۔ اگر ایمان نے حضرت موسیٰ کی والدہ کو طمانیت قلب کی بہت بڑی مقدار فراہم نہ کی ہوتی تو وہ بیٹے کو موت کے منہ میں جھونکنے پر کبھی تیار نہ ہوتیں۔

*****

ایمان ہی اصل سرچشمہ امن ہے:۔

مومن صرف خدا تعالیٰ سے ڈرتا ہے اور یہ ایک ڈر اسے خوف وبے اطمینانی کے دوسرے تمام حملوں سے محفوظ ومامون کر دیتا ہے۔ اسے اللہ کے سوا اس پوری کائنات میں کوئی دوسری طاقت ایسی نظر نہیں آتی جو اس کی زندگی اور موت یا نفع ونقصان پر اثر انداز ہوسکتی ہو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مشرک، معبودانِ باطل سے ڈراتے تھے مگر خلیل اللہ کا استدلال یہ تھا کہ تمہارے جھوٹے معبودوں سے میں کیوں ڈروں حالانکہ تم شرک کرتے ہوئے سچے خدا سے نہیں ڈرتے۔

فَاَيُّ الْفَرِيْقَيْنِ اَحَقُّ بِالْاَمْنِ.
غور تو کرو فریقین میں سے کون امن کا زیادہ مستحق ہے۔

خدا کے پرستار یا شرک کے علمبردار۔ معلوم ہوا کہ ایمان اور توحید ہی میں امن وسکون اور راز مضمر ہے اور اسُ کے مقابلے میں کفر وشرک آدمی کے اندر خوف گھبراہٹ اور بے اطمینانی پیدا کرتے ہیں۔

سَنُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا الرُّعْبَ بِمَا اَشْرَكُوْا بِاللّٰهِ (آل عمران: ۱۵۱)
ہم کافروں کے دلوں میں (دوسروں کا) رعب ودبدبہ اور خوف ڈال دیتے ہیں اس لئے کہ وہ اللہ کے ساتھ شرک روا رکھتے ہیں۔''

منکرین اور متشککین کے اندیشے:۔

منکرین حق کو سب زیادہ اضطراب لاحق ہوتا ہے۔ زمانہ اور اس کے حادثات سے نیز فقر وفاقہ اور بیماری سے وہ ہر وقت لرزہ براندام رہتے ہیں اور موت سے تو ان کے خوف کا عالم کچھ نہ پوچھیے گویا وہ کوئی خوفناک دشمن یا خونخوار درندہ ہے۔ اخلاقیات کے فلسفی ابن مسکویہ نے لکھا ہے: موت سے صرف وہ شخص خوف کھاتا ہے جو حقیقتِ موت کو نہیں سمجھتا ہے۔ نہیں جانتا کہ اس کی روح کہاں چلی جاتی ہے، وہ خیال کرتا ہے کہ اس کا بدن مٹی میں مل جائیگا تو اس کی شخصیت فنا ہو جائیگی مگر یہ عالم باقی رہےگا یا اس کے خوف کی بنیاد وہ درد والم ہوتا ہے جو عالم نزع میں آدمی اٹھاتا

ہے یا بعد موت کسی سخت سزا و عقوبت کا تصور اسے دہشت زدہ کرتا ہے یا وہ اس لئے متاسف رہا ہے کہ ڈھیروں مال جمع کر کے وہ خود خالی ہاتھ دنیا سے رخصت ہو رہا ہے، بہر حال اسی قسم کے اوہام کے تحت اس کی زندگی گزرتی ہے جو ہر آن ایک قلق، ایک خوف اور ایک اضطراب سے دوچار رہتی ہے۔

مومن رزق کے معالہ میں مطمئن رہتا ہے:۔

دنیا میں انسان کو بالعموم جو چیزیں پریشان رکھتی ہیں ان میں سے ایک رزق کا معاملہ ہے لوگ رزق کیلئے کیا کیا جتن نہیں کرتے؟ حلال و حرام کی تمیز اٹھا دیتے ہیں عزت و ناموس کو داؤں پر لگا دیتے ہیں کسی ایک ذریعہ روزگار پر انحصار کرنے کے بجائے متعدد ذرائع اختیار کرتے ہیں اور صرف اپنی ذات تک ہی نہیں بلکہ اپنی اولاد و احفاد کیلئے پشتوں تک کا بندوبست کرتے ہیں یوں ہر طرح رزق کا تحفظ کرنے کے باوجود انہیں سکون نصیب نہیں ہوتا۔ انکے مقابلے میں اہل ایمان ہیں کہ جن کیلئے رزق مسئلہ کبھی دردسر نہیں بنتا۔ وہ اللہ کی صفت ربوبیت و رزاقیت پر ایمان رکھتے ہیں انہیں یہ ارشاد باری ''وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَعَلَی اللّٰهِ رِزْقُهَا.'' (ہود:۶) فکر معاش سے بے نیاز کر دیتا ہے جب وہ اس یقین دہانی کے عین مطابق پرندوں کو آشیانوں میں درندوں کو جنگلوں میں، مچھلیوں کو سمندروں میں اور کیڑے مکوڑوں کو چٹانوں تک کے اندر رزق پہنچتے ہوئے دیکھتے ہیں تو اپنے قوی و قدیر خدا کے نظام رزق رسانی پر پوری طرح مطمئن ہو جاتے ہیں اسی اطمینان کا نتیجہ ہے کہ جب ایک مومن کو فرض پکارتا ہے تو وہ شہادت کے ارمان سینے میں پالتے ہوئے میدان جہاد کی طرف رواں دواں ہو جاتا ہے ورآنحالیکہ وہ اپنی اہلیہ چھوٹے چھوٹے بچوں اور ضعیف والدین کا واحد سہارا ہوتا ہے۔ وہ انہیں چھوڑ کر چلا جاتا ہے تو صرف اس یقین و ایمان کے سہارے کہ ان کا حقیقی سہارا خدا ہے جو اس سے زیادہ مہربان ہے اور اس سے بہتر ذرائع پیدا کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔

مومن موت سے بھی نہیں ڈرتا:۔

رزق کے بعد دوسری چیز جس کا لوگوں کو دھڑکا لگا رہتا ہے موت ہے مگر موت و حیات سے متعلق وہ واضح حقائق جو ایک مومن کے پیش نظر رہتے ہیں اگر عام لوگ بھی ان کا ادراک کر لیں تو

شاید موت کی طرف سے وہ کچھ سکون محسوس کریں۔ مومن اس حقیقت پر ایمان رکھتا ہے کہ زندگی کی مہلت اور موت کا ایک وقت معین ہے اس میں کمی بیشی اور تقدیم و تاخیر نہیں ہو سکتی۔

فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا یَسْتَاخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا یَسْتَقْدِمُوْنَ. (الاعراف: ۳۴)

دوسری چیز جسے مومن اچھی طرح سمجھتا ہے یہ ہے کہ موت سے فرار بہر حال ممکن نہیں ہے۔ ہر ذی روح پر یہ گھڑی وارد ہو کر رہنی ہے۔ ''کُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْت'' (آل عمران:۱۷۵)

ایک اور بات جو موت کے خوف کو زائل کر کے رکھ دیتی ہے یہ ہے کہ اس مرحلہ سے گزر کر ہی دار فانی سے دار الخلود کی طرف کوچ کر سکتا ہے۔ ابدی و سرمدی انعامات خداوندی سے ہمکنار ہو سکتا ہے اور انبیاء و صلحاء کے حضور میں جگہ پا سکتا ہے۔ حضرت یحیٰی بن معاذ فرماتے ہیں کہ موت کو ریب و تشکک میں مبتلا انسان ہی ناپسند کرتا ہے یہی تو وہ چیز ہے جو محبت کے قریب کرنے والی ہے کہتے ہیں کہ ایک نیک آدمی کا وقت موت آ پہنچا تو وہ اٹھا غسل کیا، خوشبو لگائی اور دو رکعت نماز ادا کرنے لگا اور چند لمحوں کے بعد جب لوگ اس کے قریب گئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ وہ قبلہ رخ پڑا ہے اور اس کی روح پرواز کر چکی ہے۔ اس کے سر کے پاس ایک کاغذ پڑا ملا جس پر یہ اشعار درج تھے۔

قل لا خوان رأونی میّتا — فبکونی ورثونی حزنا
اتظنون بانی میّتکم — لیس ھٰذ المیت والله انا
احمد اللّٰه الذی خلّصنی — وبنیٰ لی فی المعالی سکنا
لاتظنوا الموت موتا انه' — لیس الا نَقْلَةٌ من ھا ھنا

ترجمہ:۔ میرے بھائیوں سے کہو جو مجھے مردہ پا کر رنج و غم کی وجہ سے رونے اور اظہار تاسف کرنے لگے ہیں کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ میں مر گیا ہوں خدا کی قسم میں مرا تو نہیں میں تو اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھے دنیا کے مصائب سے نجات دلائی اور میرے لئے بلندیوں میں ایک مسکن تعمیر کیا بھائیو موت کو موت نہ سمجھو، یہ تو یہاں سے عالم آخرت کی طرف محض منتقل ہونا ہے۔

موت کے بارے میں یہ خوشگوار تصور خاصان امت کے ہاں ہی نہیں ملتا بلکہ عام اہل امت بھی اسی احساس سے سرشار پائے گئے ہیں ایک بدّو کا مرض شدت اختیار کر گیا تو لوگ کہنے لگے اب تو آپ مرجائیں گے اس نے پوچھا موت کے بعد میں کہا جاؤں گا؟ وہ بولے اللہ کے پاس

اس پر بدو نے کہاتو پھرخوف کس بات کا؟ اللہ ہی تو وہ ہستی ہے جو خیر وعافیت کا مصدر ومنبع ہے۔

مولانا جلال الدین رومیؒ سرِ موت سے پردہ اٹھاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ خرابی وویرانی کے بغیر آبادی نہیں ہوتی، نہ اچھی طرح کھدائی کئے بغیر قیمتی خزانہ ہاتھ لگتا ہے اسی طرح پھولوں کی ہستی فنا ہو تو پھلوں کو حیات ملتی ہے بعینہٖ روح کی تقویت اور بالیدگی اور اسے لباس جدید عطا کرنے کیلئے ضروری ہے کہ موجودہ جسد خاکی فنا کر دیا جائے اور یہ موت کے بغیر ممکن نہیں مزید برآں کسی نعمت کو سلب کرنے کے بعد اللہ کی صفت جود وسخا کا تقاضا یہ ہے کہ اس سے بڑی نعمت عطا کرے۔ پس اگر وہ دنیائے فانی کی حیات ناپائیدار سلب کرتا ہے تو کچھ اس لئے نہیں کہ اسے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے فنا کر دے بلکہ اس لئے کہ حضرت انسان کو اس سے بہت بہتر حیات جاوید عطا کرے۔

*****

ایمان اوراُمید

مومن کو جن ذرائع سے اطمینان قلب حاصل ہوتا ہے ان میں سے ایک کا نام امید ہے۔ یہ وہ احساس ہے جو زندگی کی شب تاریک کو منور کرتا ہے۔ اور زندگی کی خوفناک اور پر پیچ گزرگاہوں میں انسان کو عمل کی صاف سیدھی شاہراہ دکھاتا ہے شجر زندگی کو اس سے بالیدگی ملتی ہے تمدن کا عظیم الشان قصر اپنی تعمیر کیلئے اس کا مرہون منت ہے اور اسی کی بدولت سعادت وخوش بختی کا مزہ قائم رہتا ہے۔

امید انسان میں عمل کا داعیہ پیدا کرتی ہے اور مداومت عمل پر اسے اُبھارتی ہے کاہل کو چست اور چست کو اور زیادہ سرگرم عمل بنا دینا اس کا ادنیٰ کرشمہ ہے۔ کسان کو جو چیز دن رات کھیت میں خون پسینہ ایک کرنے پر مجبور کرتی ہے وہ اچھی فصل کی امید ہے تاجر خطرناک سفر اختیار کرتا ہے تو نفع کی امید پر طالب علم کبھی محنت نہ کرتا اگر اسے کامیابی کی امید نہ ہوتی ایک سپاہی اگر شجاعت وجوانمردی کا بھرپور مظاہرہ کرتا ہے تو اس کا محرک فتح وظفر مندی کی امید کے علاوہ اور کیا ہوتا ہے۔ مریض کڑوی کسیلی دوائیں خوشی خوشی کھالیتا ہے واس کی وجہ بھی صحت یاب ہونے کی امید ہے۔ ٹھیک اسی طرح ایک بندہ مومن اگر خواہش نفس کی مخالفت اور اپنے پروردگار کی ہر حالت میں اطاعت کرتا ہے تو اس عمل کے پیچھے بھی یہ امید ہی کارفرما ہوتی ہے کہ اسے اپنے پروردگار کی ہر حالت میں اطاعت کرتا ہے تو اس عمل کے پیچھے بھی یہ امید ہی کارفرماتی ہے کہ اسے اپنے پروردگار کی رضا اور خوشنودی حاصل ہوگی، اور وہ اس کے انعامات فراواں کا مستحق ٹھہرے گا غرض یہ

مااضيق العيش لولا فسحة الامل

زندگی کتنی تنگ ہوتی اگر امید نے اسکا دائرہ کشادہ نہ کر دیا ہوتا

اس کے مقابلے میں ناامیدی ہے جو سینے میں روشن شعلۂ امید کو بجھا دیتی ہے اور حرکت وعمل کے تمام اسباب ودواعی کو یکسر ختم کر دیتی ہے۔ حضرت ابن مسعودؓ فرماتے ہیں۔ ”ہلاکت کا باعث دو چیزیں ہیں ناامیدی اور تکبر۔ امام غزالیؒ نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ ان کو جمع اس لئے کیا گیا ہے کہ حصول سعادت، سعی وطلب اور کوشش مزید کے بغیر ممکن نہیں لیکن

مایوس آدمی نہ عمل کرتا ہے نہ مطالبہ اور مغرور و متکبر آدمی تھوڑی سی کوشش کو بھی کافی سمجھ بیٹھتا ہے۔ نتیجۃً دونوں ناکام رہتے ہیں اور یہ ناکامی وہ چیز ہے کہ جس کے ڈانڈے ہلاکت سے جا ملتے ہیں۔ پس ثابت ہوا کہ زندگی سعادت سے ہمکنار زندگی کیلئے ناگزیر ہے کہ وہ پرامید رہے۔

یاس اور کفر لازم وملزوم ہیں:۔

یاس کا عنصر سب سے زیادہ منکرین خدا اور کفار میں پایا جاتا ہے یا پھر ان لوگوں میں جن کا ایمان بہت کمزور ہوتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ کافر صرف اپنے بل بوتے پر جیتا ہے اور اس کی نظر مادی وسائل پر ہی ہوتی ہے اب ظاہر ہے کہ اس عظیم کارخانۂ قدرت میں ایک انسان کی اوقات ہی کیا ہے؟ اور اس کے اپنے وسائل کی حیثیت کیا؟ جن وسائل کو اس نے سب کچھ سمجھ رکھا ہوتا ہے وہ بہت جلد جواب دے جاتے ہیں تو ان کے بعد پھر مایوسی ہوتی ہے۔

اِنَّهٗ لَا يَيْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ. (یوسف: ۸۷)

پھر چونکہ کافر کا اپنے خدا کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوتا بنا بریں اسے مایوسی سے کوئی چیز بچا نہیں سکتی پس جو شخص جتنا زیادہ مایوسی کا شکار ہوگا اتنا ہی بڑا کافر ہوگا اور جس کا کفر انتہا درجہ کا ہوگا۔ اس کی مایوسی بھی بلا نہایت ہوگی مایوسی کے لوازم میں کفر کے علاوہ شک بھی ہے ہر وہ شخص جو اللہ کے وجود اور یوم حساب میں شک رکھتا ہے اس کے حکیم اور عادل ہونے کا پورا یقین نہیں رکھتا اس کا دامن بھی امید سے تہی ہوتا ہے اسے نہ لوگوں سے خیر کی امید ہوتی ہے نہ اس کائنات سے نہ خود زندگی سے وہ سیاہ عینک کے ساتھ دنیا کو دیکھتا ہے۔ اس وجہ سے اسے ہر چیز سیاہ اور شر وفساد سے مملو نظر آتی ہے۔ اسے روئے زمین ایک جنگل اور اس میں بسنے والے انسان وحشی اور درندے دکھائی دیتے ہیں۔ اس تناظر میں اسے زندگی ایک ناقابل برداشت بوجھ محسوس ہوتی ہے۔ کچھ ایسا ہی تاثر زندگی کے بارے میں قائم کر کے ابوالعلاء معری نے یہ شعر کہا ہوگا۔

هذا جناهُ ابی علیّ　　وما جنیتُ علیٰ اَحد

یہ میری زندگی ایک ایسا جرم ہے جو میرے باپ سے سرزد ہوا لیکن میں نے ایسا جرم کسی پر نہیں کیا یعنی میں کسی کی پیدائش کا سبب نہیں بنا۔

ایمان امید کو جنم دیتا ہے:۔

جس طرح یاس اور کفر لازم وملزوم ہیں اسی طرح امید اور ایمان بھی متلازم ہیں چنانچہ ایک ایماندار سب سے زیادہ پرامید اور خوش گمان ہوتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ایمان نام ہی اس اعلیٰ اور عظیم طاقت کو تسلیم کرنے کا ہے جو اس کائنات کا انتظام کر رہی ہے، جس سے کوئی چیز مخفی نہیں اور جو کسی کام سے عاجز نہیں ایسی ہستی، جو ہر مجبور و مضطر کی پکار سنتی ہے، جواب دیتی ہے اور اس کی مصیبت کو دور کرنے کی پوری پوری صلاحیت رکھتی ہے اس کو، ماننے والا ناامید کیسے ہوسکتا ہے۔

وہ الہٰ جو اپنے بندوں پر اس سے کہیں زیادہ مہربان ہو جتنی کہ ماں بچہ پر ہوتی ہے وہ الہٰ جو دن کے وقت جرم کرنے والوں کو معاف کرنے کیلئے رات کو انہیں اس بات کیلئے پکارتا ہو کہ وہ آئیں اور اس کی بارگاہ میں عفوطلب کریں۔ وہ الہٰ جو گنہگار کو آمادہ توبہ دانا بت دیکھ کر اس سے زیادہ خوش ہوتا ہو جتنا صحرائے لق ودق میں اپنے سروسامان اور سواری کو گم کرنے والا قریب المرگ مسافر، سواری کو اچانک سامنے پا کر خوش ہوسکتا ہے وہ الہٰ جو ایک نیکی کا بدلہ سات سو نیکیوں کے برابر دیتا ہو اور بدی کا بدلہ صرف ایک ہی بدی کے برابر دے یا بالکل ہی معاف کر دے۔ وہ الہٰ جو اعراض کرنے والے کو قریب سے بلاتا ہے اور رجوع کرنے والے کی طرف دور سے توجہ دیتا ہے...... اس الہٰ پر ایمان کیا امید کو جنم نہ دے گا؟ خیر و عافیت کی امید کو، عفو تقصیر کی امید کو، حسن انجام کی امید کو اور ابدی و سرمدی سعادت کے حصول کی امید کو۔

مومن اور مادہ پرست کی امیدوں کا فرق:۔

مومن کی امید ورجاء کی کوئی حد ہی نہیں ہوتی کیونکہ اس کے رب رحیم کے فضل وکرم اور رحمت کی بھی کوئی حد نہیں ہے۔ مزید برآں اس کی امید کوئی خام اور ناپختہ قسم کی امید نہیں ہوتی بلکہ نہایت مضبوط اور ناقابل شکست ہوتی ہے وجہ ظاہر ہے وہ اللہ کے ساتھ ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ وہ اللہ کیلئے جی رہا ہوتا ہے اور اللہ اس کیلئے اپنی لامحدود طاقت وقف کر دیتا ہے۔ پھر اس کے بعد امید ٹوٹنے کا سوال کہاں پیدا ہوتا ہے؟

مومن جب لڑتا ہے تو فتح کی مضبوط امید کے ساتھ لڑتا ہے۔ ''وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ

الغالِبُوْنَ' وہ بیمار ہو جاتا ہے تو صحت کی پختہ امید کے ساتھ مرض کا مقابلہ کرتا ہے۔ "وَاِذَامَرِضْتُ فھُوَ یَشْفِیْنِ" اس سے کوئی گناہ سرزد ہو جاتا ہے تو امید مغفرت کا دامن اس کے ہاتھ سے کبھی نہیں چھوٹتا۔ "اِنَّ اللّٰہ یَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِیْعاً" اس پر تنگی و مشکلات کا زمانہ آ جائے تو وہ کشائش اور فراخی کی امید رکھتا ہے "اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْراً" وہ کسی حادثہ کا شکار ہو جائے تو "اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ" پڑھتے ہوئے اللہ سے اجر کا امیدوار ہوتا ہے۔ "اُولٰئِکَ عَلَیْھِمْ صَلَوَاتٌ مِّنْ رَّبِّھِمْ وَرَحْمَۃٌ" وہ پیر فرتوت بھی ہو جائے تو اسے اولاد کی امید رہتی ہے۔ "وَلَمْ اَکُنْ بِدُعَائِکَ رَبِّ شَقِیّاً" اور وہ دنیا میں کفر و باطل کا غلبہ دیکھتا ہے تو کبھی یاس و قنوط کا شکار نہیں ہوتا بلکہ استیلائے حق اور زوال باطل کی امید قائم رکھتا ہے۔ "اِنَّ الْبَاطِلَ کَانَ زَھُوْقاً۔"

مادہ پرست ظاہری اسباب پر نظر رکھتے ہیں اور ان کے پیچھے کار فرما اللہ کی عظیم طاقت کو تسلیم نہیں کرتے، مگر خدا پرست اسباب و وسائل کو اختیار کرنے کے ساتھ ساتھ نظر صرف خدا پر رکھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ مادہ پرست جب ناامید ہو جاتے ہیں اور ان پر دنیا باوجود فراخی کے تنگ ہو جاتی ہے تو خدا پرستوں پر دائرہ حیات پھر بھی کشادہ رہتا ہے مومن کی بیماری کو طبیب لاعلاج قرار دیتے ہیں تو وہ مایوس نہیں ہوتا بلکہ خدا سے امید شفا قائم رکھتا ہے۔ اس کی پریشانی و محرومی اور اس کی مظلومیت کا کوئی مداوا نہ کر سکتا ہو تو اس کیلئے فکر کی کوئی بات نہیں ہوتی وہ خدا کو ہر آن اس قابل سمجھتا ہے کہ اس پر ہونے والے ظلم کا ازالہ کر دے اور اس کی پریشانی کو دور فرما دے سیّدنا ابراہیم اور حضرت زکریاؑ ظاہری اسباب کے لحاظ سے قطعاً اس قابل نہ تھے ان کو اولاد عطا ہو سکتی مگر دنیا نے دیکھا کہ وہ نعمت اولاد سے ہمکنار ہوئے، حضرت یونس اور حضرت ایوبؑ پر ابتلاء کی ایسی گھڑیاں آئیں کہ جن میں کوئی ان کیلئے کچھ نہ کر سکتا تھا مگر وہ اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہوئے اللہ تعالیٰ نے انہیں بھی گوہر مقصود عطا کر دیا حضرت موسیٰؑ بنی اسرائیل کو لے کر جا رہے تھے۔ ساحل سمندر پر پہنچ کر دیکھا تو پیچھے فرعون کے لشکر تھے اور آگے سمندر کے تند و تیز تھپیڑے مگر حضرت موسیٰؑ کو اپنے رب کی قدرت کاملہ کا یقین محکم تھا اور بنی اسرائیل کی نجات کی پوری امید تھی چنانچہ اللہ تعالیٰ نے سمندر کو پایاب بنا کر حضرت موسیٰؑ اور ان کی قوم کو ظالموں کے تسلط سے آزادی بخشی دوسری طرف فرعون کو لشکر سمیت غرق کر دیا۔

تاریخ کے یہ وہ واقعات ہیں جو ہر شک و شبہ سے بالاتر ہیں مگر مادہ پرست ان میں سے بعض کا یا سب ہی کا انکار کر دیتے ہیں۔ اس لئے کہ ان کا وقوع ان کے خیال میں معلوم اور معتاد اسباب کے ماتحت نہیں لیکن اہل ایمان تو سمجھتے ہیں کہ ظاہری اسباب اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ و مطلقہ کو محدود نہیں کر سکتے ان اسباب کے بندوں سے کوئی پوچھے کہ اگر معتاد اسباب ہی اصل حقیقت ہوتے ہیں اور ان کے خلاف یا ان سے بالا کسی چیز کے بارے میں کچھ سوچنا اور بولنا معقول ہے تو کیا اس طرز فکر کے ساتھ کسی قسم کی علمی ترقی ممکن ہے کیا معتاد اسباب کے مقلد بن کر ہم ایٹمی اور خلائی دور میں داخل ہو سکتے تھے اگر قدیم زمانہ کا تانگہ بان یہ کہتا کہ آمد و رفت کا ذریعہ تو بس یہ تانگے اور رتھیں وغیرہ ہی ہیں، ہوائی جہاز میں بیٹھ کر سفر کرنا تو کسی طرح ممکن ہی نہیں کیونکہ یہ معتاد اسباب کے خلاف بات ہے تو کیا تانگہ بان کی اس بات کو درست تسلیم کر لیا جاتا اگر نہیں تو مادہ پرستوں کی خدا کے معاملے میں یہ جسارتیں کیسے درست ہو سکتی ہیں؟

امید زندگی کیلئے ناگزیر ہے:۔

اگر امید کا وجود نہ ہوتا تو آج علمی ترقیات کا نام و نشان بھی نہ ہوتا اہل علم و ایجاد اپنے زمانہ کے ثابت شدہ امور سے آگے صرف اس امید پر قدم بڑھاتے رہے کہ وہ نامعلوم حقائق کو دریافت کریں گے اور زندگی کی بہتر سے بہتر سہولتیں فراہم کر سکیں گے چنانچہ جب انہوں نے دامن امید پکڑ کر جدوجہد کا آغاز کیا تو کامیابی نے ان کے قدم چومے۔

داعیان حق، مصلحین امم اور تحریکوں کے بانی اگر اس امید سے سرشار نہ ہوتے کہ ان کا مشن کامیاب رہے گا تو کیا وہ میدان عمل میں کودتے؟ اور اگر بے دلی کے ساتھ کود بھی پڑتے تو کیا ان کی حیثیت ان سپاہیوں کی سی نہ ہوتی جو اسلحہ کے بغیر محاذ جنگ پر پہنچ جائیں ایسی سپاہ کا مقدر فتح و نصرت تو نہیں ہو سکتا۔

عام زندگی کے معمولات میں اگر امید ہمرکاب ہو تو مشکل کام آسان اور بعید چیز قریب ہو جاتی ہے لیکن مایوسیاں آدمی کو گھیر لیں تو آسان ترین کام بھی مشکل دکھائی دیتے ہیں اور قریب الحصول مقاصد ناممکن نظر آنے لگتے ہیں یہ عظیم الشان تمدن پرشکوہ ادارے آمد و رفت کے حیرت انگیز وسائل اور رواں دواں حیات کے جملہ مظاہر امید ہی کے تو متعدد کرشمے ہیں۔

ایک مسلمان کی حیثیت سے ہمارے لیے اسوہ حسنہ ہادی برحق رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ ہے۔ آیئے ذرا اس امر کا جائزہ لیں کہ اس میں امید کس حد تک جلوہ گر نظر آتی ہے سب سے پہلے

آپؐ تیرہ سال تک مکہ میں دعوت اسلام دیتے رہے۔ طنز وطعن، تضحیک واستہزاء شدید مخالفت، ظلم وتشدد اور مقاطعہ تک نوبت پہنچی اور آپ اپنے پیرؤوں کو حبشہ کی طرف ہجرت کر جانے کا حکم دینے پر مجبور ہو گئے لیکن آپؐ نے حوصلہ نہیں ہارا اور فانوسِ امید برابر آپؐ کے سینے میں روشن رہا حضرت خبابؓ بن الادت جن کا آقا لوہے کی سلاخیں گرم کر کے ان کی پشت کو داغ دیتا تھا۔ رسول پاکؐ کے پاس آتے ہیں اور بے پناہ مصائب اور ناقابل برداشت اذیتوں کی شکایت کرتے ہوئے آپ سے کافروں کیلئے بددعا کی درخواست کرتے ہیں تا کہ ان کو قوم عاد وثمود کی طرح تباہ و برباد کر ڈالا جائے مگر چہرہ رسالتمآبؐ اس درخواست سے الٹا متغیر ہو جاتا ہے۔ آپؐ حضرت خبابؓ کو صبر واستقامت کی تلقین کرتے ہیں اور مستقبل کی کامیابی کی امید کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں ''اے خبابؓ تم سے پہلے حق وصداقت کے علمبرداروں کو لوہے کہ آروں سے دولخت کر دیا جاتا تھا مگر انہیں کوئی راہِ راست سے منحرف نہ کر سکا، خدا کی قسم یہ دین ضرور غالب ہو کر رہے گا اور ایک تنہا سفر کرنے والا صنعا سے حضر موت تک جائیگا اور اللہ کے سوا اسے کسی کا خوف نہ ہوگا مگر تم لوگ جلد بازی سے کام لیتے ہو۔'' غور فرمایئے اس سنگین صورت حال پر استقامت کے پیچھے کیا شے کارفرما ہے اور ان ارشادات کے پس پردہ کیا چیز بول رہی ہے؟

پھر نبی آخر الزماںؐ اور آپ کے تمام پیرو مدینہ کی طرف ہجرت کر جاتے ہیں ہجرت کے موقع پر آپ کا تعاقب کیا جاتا ہے اور آپ کے پیرؤوں کو تنگ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے مگر کسی کے پائے ثبات میں لغزش نہیں آئی۔ مدینہ پہنچ کر بھی مسلمانوں کو چین نہیں لینے دیا جاتا نت نئی جنگوں اور آئے دن کی جھڑپوں سے سابقہ پیش آتا ہے حتیٰ کہ ایک موقع پر پورا عرب مدینہ کی چھوٹی سی آبادی پر پل پڑتا ہے۔ مدینہ کے اندر یہود اور منافقین کی ریشہ دوانیاں اس پر مستزاد ہیں اس موقع پر جب قرآن کے الفاظ میں خوف کے مارے آنکھیں پتھرا گئی تھیں اور کلیجے منہ کو آ گئے تھے کیا اللہ کی نصرت کی امید کے علاوہ کوئی اور چیز تھی جس نے مسلمانوں کو سہارا دیا؟

مختصر یہ کہ دنیا کے اس عظیم داعی حقؐ کی نہایت پرخطر اور مشکل زندگی میں جو چیز قدم قدم پر ولولۂ تازہ دیتی نظر آتی ہے ہر آن حوصلہ بڑھاتی اور مزاحمت ومدافعت پر مسلمانوں کو ابھارتی ہے اور بالآخر نسبتاً کم وسائل رکھنے کے باوجود ابتداء عرب کے وسیع وعریض علاقے پر اور بعد ازاں چار دانگ عالم میں ان کی عظمت کے جھنڈے گاڑ دیتی ہے وہ امید ہے صرف امید...... اللہ کے بے حد وحساب انعام واجر کی امید شہادت وفتح مندی کی امید اور تائید ونصرت الٰہی کی امید۔

ایمان اور محبت

''اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے تم جنت میں داخل نہ ہو گے جب تک ایمان نہ لے آؤ اور تم ایماندار نہ ہو گے جب تک ایک دوسرے سے محبت نہ کرنے لگو''...........
ارشاد رسالتمآبؐ...... محبت، رضا سے معناً خاص تر اور اثرات کے اعتبار سے عمیق تر ہے۔ آدمی بسا اوقات کسی چیز یا شخص سے راضی ہوتا ہے لیکن اس کے ساتھ گہرا قلبی تعلق نہیں رکھتا یہی قلبی تعلق رضا اور محبت کے فرق کو واضح کرنے والی چیز ہے، محبت روح موجودات، اکسیرِ قلوب اور جانِ امن وسلامتی ہے جس طرح قانون کشش کے تحت یہ کرہ خاک، دیگر سیارے اور افلاک اپنی اپنی جگہ پر قائم ہیں اسی طرح جذبہ محبت تعلقات انسانی کو خراب ہونے یا تصادم کی صورت اختیار کرنے سے بچاتا ہے، محبت کی اہمیت انسان اچھی طرح سمجھتا ہے اور یہ کسی نے کہا ہے کہ اگر محبت منصب سیادت پر فائز ہو جائے تو دنیا کو نہ عدل کی ضرورت رہے نہ قانون کی اس سے محبت کی قدر وقیمت ہی کا صحیح اظہار ہوتا ہے۔ مولانا رومیؒ نے محبت کے اثرات کو بڑی خوبی سے بیان کیا ہے وہ فرماتے ہیں ''محبت تلخ کو شیریں، مٹی کو سونا، کدورت کو صفا اور درد والم کو شفا میں تبدیل کر دیتی ہے محبت تکلیف کو نعمت، قہر کو رحمت اور زندان کو جنت بنا دیتی ہے یہ وہ چیز ہے جو لوہے کہ نرم کرتی ہے پتھر کو پگھلا دیتی ہے اور تن مردہ میں حیات تازہ پھونک دیتی ہے'' مشہور صحافی اور ادیب استاذ محمد ذکی عبدالقادر، نے تمثیل کے پیرائے میں نفسانی رجحانات کا تذکرہ بدیں الفاظ کیا ہے میں نے دور وسط بحر میں کچھ روشنیاں دیکھیں جیسے درخشاں ستارے ہوں اور خواہش کی کہ مجھے بھی مستقبل میں ایسا ہی چراغ ہدایت میسر ہو اور ہم میں سے کون ہے جو اپنے مستقبل کو تابناک ستارے کی چمک سے محروم دیکھنا چاہتا ہے تابناک ستارہ آنے والے دور میں راہنمائی کیلئے...... بھلا وہ کیا ہو سکتا ہے؟ کیا حکمت وفلسفہ؟ مگر وہ کلام خشک کے علاوہ ہمیں کیا دے سکتا ہے؟ کیا حذر واحتیاط؟ مگر اس کے پاس ایک خوف مسلسل کے سوا اور ہے کیا؟ کیا عمل؟ مگر وہ تو اپنے دامن میں تعب اور مشقت ہی رکھتا ہے یا پھر مال ودولت؟ نہیں وہ بھی نہیں وہ تو ان سب کا مجموعہ ہے خوف، احتیاط، محنت، مصیبت تو پھر مستقبل کا نجم تابندہ کسے قرار دیں؟ کیا محبت؟ ہاں ہاں بلاشبہ یہی وہ منفرد جوہر ہے جو ہمیں امن وامان اور سلامتی وعافیت سے ہمکنار کر سکتا ہے، محبت ہر چیز سے محبت

، ہر انسان سے محبت، ہر نعمت سے ہی نہیں ہر مصیبت سے بھی۔ محبت نعمت سے محبت جنگ وجدال کی گرمی کو کم کر دیتی ہے اور مصیبت سے محبت اس کا مقابلہ کرنے کی تاب وتوانائی عطا کرتی ہے۔ کیا جملہ موجودات سے اس نوعیت کی محبت کوئی کر سکتا ہے؟ کوئی نہیں سوائے اس شخص کے جس کے دل میں بشاشت ایمان گھر کر چکی ہو۔ ایمان ہی مصفا اور مدام محبت کا خزانہ ہے اور صرف مومن ہی خدا کی پیدا کردہ ہر چیز سے محبت کر سکتا ہے۔ حتیٰ کہ زندگی اور موت سے بھی۔

اللہ تعالیٰ کی محبت:۔

ایمان سب سے پہلے انسان کے دل میں اللہ کی محبت پیدا کرتا ہے۔ وہ اللہ جو خلق امر کا نقطہ آغاز اور ایجاد وامداد کا مصدر ہے، جو خود جمیل ہے اور جس کی پیدا کردہ ہر چیز حسن وجمال کی آئینہ دار ہے جو خود کامل واکمل ہے اور جس کے مظاہر کمال، ذرات خاک سے لے کر سیارگان نور تک ہر جگہ پائے جاتے ہیں اور ہر تشنہ کمال اسی کی طرف رجوع کرنے پر مجبور ہے مومن اس لئے بھی اللہ تعالیٰ سے محبت کرتا ہے کہ لطف واحسان کا سرچشمہ اصلی وہی ہے اور اپنے محسن سے محبت کرنا عین اقتضائے فطرت ہے پھر سب سے بڑے محسن سے تو سب سے زیادہ محبت ہونی چاہیے۔

اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً. (لقمان: ۲۰)

”کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ نے زمین اور آسمان کی ساری چیزیں تمہارے لئے مسخر کر رکھی ہیں اور اپنی کھلی اور چھپی ساری نعمتیں تم پہ تمام کر دی ہیں“۔

صاحب ایمان پر اللہ تعالیٰ کے جو ان گنت احسانات ہیں ان کی بنا پر وہ اللہ تعالیٰ سے اپنی ذات اپنے اہل وعیال اپنے والدین اور دنیا کی ہر چیز سے زیادہ محبت کرتا ہے اللہ کی کتاب سے محبت کرتا ہے جو نوع انسانی کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لاتی ہے اللہ کے رسولؐ سے محبت کرتا ہے جو رحمۃ للعالمین ہیں اور ہر اس انسان سے محبت کرتا ہے جو صاحب خیر وصلاح ہے کہ ان سب سے محبت تقاضائے ایمان ہے۔

اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنِيْ حُبَّكَ وَحُبَّ مَنْ يُّحِبُّكَ وَاجْعَلْ حُبَّكَ اَحَبَّ اِلَيَّ مِنَ الْمَاءِ الْبَارِدِ.

جملہ موجودات سے محبت:۔

اس عالم مادی سے بھی مومن کا تعلق عداوت ونفرت کا نہیں بلکہ محبت کا تعلق ہے کیونکہ یہ عالم اس کی نظر میں اللہ کی آیات کا ایک گنجینہ ہے اسے اس عالم کی کوئی چیز بھی عبث اور فضول نظر نہیں آتی وہ ہر شے میں کمال درجے کی حکمت ودانائی، حیرت انگیز توازن وتناسب اور بے نظیر تقدیر وتقسیم کا اہتمام دیکھتا ہے۔ وہ کھلی آنکھوں سے جب اس عالم طبیعی کا مشاہدہ کرتا ہے تو یہ محسوس کئے بغیر نہیں رہتا کہ ایک طرف اگر ہر چیز ذات حق کی تسبیح وتحمید کر رہی ہے تو دوسری طرف خود انسان کیلئے مسخر ہو کر بزبان حال اسے خلافت ارضی کا اہل تسلیم کرتی ہے۔ ایسے عالم کو جس کا ذرہ ذرہ عظمت آدم کو خراج اطاعت پیش کر رہا ہے۔ مومن بنظر حقارت کیوں دیکھے اور کیوں اس کی تباہی وبربادی کا خواہاں ہو۔

پھر یہ دنیا اختلاف احوال اور تغیر وتنوع سے عبارت ہے اس کے تنوع اور تغیر کو بعض لوگ پسند نہیں کرتے اور رات اور دن کے اختلاف سے الٰہ خیر کے ساتھ ساتھ ایک الٰہ شر کے وجود کا یقین کر لیتے ہیں جبکہ مومن ظلمت ونور کے تسلسل کو اللہ کی ایک بڑی نعمت اور اس کی توحید کی ایک بہت بڑی نشانی قرار دیتا ہے۔

قُلْ اَءَيْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ النَّهَارَ سَرْمَدًا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِلَيْلٍ تَسْكُنُوْنَ فِيْهِ ط اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ. وَمِنْ رَّحْمَتِهٖ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ. (القصص ۷۲۔۷۳)

”(اے نبیؐ) ان سے کہو کبھی تم لوگوں نے غور کیا کہ اگر اللہ قیامت تک تم پر ہمیشہ کیلئے دن طاری کر دے تو اللہ کے سوا وہ کون سا معبود ہے جو تمہیں رات لا دے تاکہ تم اس سے سکون حاصل کر سکو۔ کیا تم کو سوجھتا نہیں یہ اس کی رحمت ہے کہ اس نے تمہارے لئے رات اور دن بنائے تاکہ تم (رات میں) سکون حاصل کر سکو اور (دن کو) اپنے رب کا فضل تلاش کرو تاکہ تم شکر گزار بنو“۔

یوں اس عالم طبیعی کے اختلاف شب وروز کو ایک مومن جب اپنے لئے مفید اور سازگار پاتا ہے تو اسے کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ آب وگل کے اس جہاں سے محبت نہ کرے۔

افلاک کے مسخر شدہ سیارے اور زمین کے منفعت بخش خطے تو ایک طرف رہے رسول اللہؐ

نے تو بعض ان مقامات کو بھی اپنی محبت اور پسندیدگی کی سند عطا کی جہاں سے ظاہر ہیں لوگ شگونِ بد، لے سکتے تھے۔ امام بخاریؒ نے حضرت انسؓ بن مالک خادم رسول اللہؐ سے روایت کیا کہ جب آپ خیبر گئے تو میں بھی بغرض خدمت آپ کے ساتھ تھا۔ واپسی پر آپ کو جبل احد نظر آیا تو آپؐ نے فرمایا: ''ھٰذَا جَبَلُ یُحِبُّنَا وَنُحِبُّہٗ'' یہ وہ پہاڑ ہے جو ہم سے محبت کرتا ہے اور اس سے ہم بھی محبت کرتے ہیں غور فرمایئے کہ اس پہاڑ کی وہ کیا خصوصیت تھی جس کی بناء پر اس سے محبت کا ذکر کیا گیا ہے حالانکہ اس کے دامن میں لشکر اسلام کو شکست ہوئی تھی۔ رسول پاکؐ خود زخمی ہو گئے تھے اور ستر کے لگ بھگ صحابہ کرام شہید ہو گئے تھے۔ اس ہزیمت کے باوجود محبت کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ اسی خطۂ زمین کے پہلو میں مسلمانوں کو یہ سبق دیا گیا تھا کہ خدا اور رسول کی اطاعت کے بغیر دنیا و عقبیٰ میں کامیابی محال ہے نصرت الٰہی حاصل نہ ہو تو محض ساز و سامان اور افراد کی طاقت اہل حق کو سربلند نہیں کر سکتی پس مومن جب روئے زمین و اوج افلاک پر ہر جگہ خدا کی آیات موجود پاتا ہے تو کائنات کے گوشے گوشے سے محبت کرنا یقینی ہو جاتا ہے۔

زندگی سے محبت:۔

مومن زندگی سے بھی محبت کرتا ہے وہ اسے گناہ سمجھتا ہے نہ جرم اور نہ دنیا میں آنے پر والدین کو کوستا ہے، نہ خدا کو، وہ حیات دنیا کو اللہ تعالیٰ کی ایک امانت اور نعمت سمجھتا ہے جس کا شکر ادا کرنا واجب ہے۔ حدیث نبویؐ ہے۔

خیر الناس من طال عمرہ، وَحُسنَ عملُہ،

''خیر و سعادت سے سب سے زیادہ بہرہ در وہ شخص ہے جس نے لمبی عمر پائی اور جسے اچھے کام کرنے کی توفیق ملی''۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ تم میں سے کوئی موت کی آرزو نہ کرے اور نہ اس کے آنے سے پہلے اس کی دعا کرے کیونکہ جب آدمی مر جاتا ہے تو اس کی مہلتِ عمل ختم ہو جاتی ہے اور یہ حقیقت ہے کہ مومن کیلئے عمر رواں خیر میں اضافہ ہی کا سبب ہوتی ہے ایک مقام پر عمومی طور پر فرمایا تم میں سے کوئی موت کی خواہش نہ کرے کیونکہ اگر وہ نکوکار ہے تو ہو سکتا ہے اس کی نیکی میں اضافہ ہو جائے اور اگر وہ غلط کار ہے تو ممکن ہے آنے والے وقت میں اسے توبہ دانابت الی اللہ کی توفیق مل

جائے ان ارشادات رسولؐ سے ثابت ہوتا ہے کہ زندگی کو بہر صورت خیر ہی پر محمول کرنا چاہیے اور ایک صاحب ایمان کیلئے تو یہ فی الحقیقت سراپا خیر ہی ہے۔

موت سے محبت:۔

مومن زندگی سے محبت اس لئے نہیں کرتا کہ دنیا کے ادنیٰ لذائذ و منافع سے وہ متمتع ہو رہا ہے بلکہ اس لئے کرتا ہے کہ یہاں اسے حقوق اللہ ادا کرنے کا موقع ملتا ہے جس کے نتیجے میں موت کی سرحد پار کرتے ہی وہ اپنے رحیم و شفیق پروردگار سے ملاقات کی نعمت پاتا ہے۔ ایسی صورت میں بھلا وہ موت سے کیوں گھبرائے گا۔ وہ موت جس سے دیدار الٰہی نصیب ہو سکتا ہو۔ حضرت علیؓ پر جب ابن ملجم نے مہلک وار کیا تو آپ کی زبان فیض ترجمان سے یہ الفاظ نکلے:

فُزْتُ بِرَبِّ الْکَعبہ   ربّ کعبہ کی قسم میں کامیاب ہو گیا

ایسے مواقع پر کوئی بات بنائی نہیں جا سکتی بلکہ بے اختیار اس حقیقت کا اظہار ہو جاتا ہے جو انسان کے دل و دماغ اور رگ و پے میں سرایت کر چکی ہو۔ حضرت بلالؓ کا وقت وفات آیا تو ان کی اہلیہ محترمہ کی چیخیں نکل گئیں اور ''واکرباہ واکرباہ'' (ہائے مصیبت کہنے لگیں۔ سیدنا بلالؓ نے سنا تو فرمانے لگے۔ واطرباہ! واطرباہ (واہ واہ کیوں نہیں کہتی وفات کے فوراً بعد میں اپنے پیاروں سے ملاقات کرنے والا ہوں محمدؐ سے اور ان کے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین سے حضرت خالد بن ولید جب ایران و روم کے سپہ سالاروں سے خط و کتابت کرتے تو انہیں لکھتے اسلام قبول کر لو سلامتی پاؤ گے۔ بصورت دیگر میں تمہاری طرف ایک ایسی فوج روانہ کروں گا جو موت سے اتنی محبت کرتی ہے جتنی محبت تم حیات دنیا سے کرتے ہو۔

ابنائے نوع سے محبت:۔

اہل ایمان تمام لوگوں سے محبت کرتے ہیں کیونکہ اللہ کے بندے اور آدمؑ کی اولاد ہونے میں سب یکساں ہیں سب ایک دوسرے سے رحم و نسب کے رشتے میں بندھے ہوئے ہیں سب کا مقصد حیات (خدا کی بندگی و عبادت) ایک ہے اور ایک ہی سب کا دشمن ہے یعنی شیطان اس ہمہ گیر اشتراک کا تقاضا ہے کہ عالم انسانیت سے تعلقات محبت استوار کئے جائیں ان تعلقات محبت

کو استوار کرنے کیلئے اسلام نے توحید، رسالت اور اخوت انسانیت کے عقائد دیئے ہیں۔ امام احمدؒ اور ابوداؤدؒ نے حضرت زید بن ارقمؓ کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہؐ ہر نماز کے بعد یہ دعا کیا کرتے تھے:

اللھم ربنا ورب کل شیئ وملیکہ انا شھید انک الرّب وحدک الاشریک لک اللھم ربنا وربّ کل شیئ انا شھید ان محمدًا عبدک ورسولک الکھم ربنا ورب کل شیئ انا شھید ان العباد کلھم اخوۃً.

"اے اللہ ہمارے اور ہر چیز کے پروردگار اور بادشاہ میں گواہی دیتا ہوں کہ تو اکیلا ہی پروردگار ہے اور تیرا کوئی شریک نہیں اے اللہ ہمارے اور ہر چیز کے پروردگار میں گواہ ہوں کہ محمد تیرا بندہ اور رسول ہے۔ اے اللہ ہمارے اور ہر چیز کے پروردگار میں اس امر کی شہادت دیتا ہوں کہ تمام بندے بھائی بھائی ہیں۔"

سرورِ کونینؐ کے ان دعائیہ کلمات سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ نوع انسان کی اخوت ومحبت کوئی ضمنی حیثیت رکھنے والا مسئلہ نہیں بلکہ توحید ورسالت جیسے بنیادی عقائد کی طرح بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

رنگ، نسل، زبان اور علاقائی بنیاد پر قائم ہونے والے تمام امتیازات بھی اسلام نے اسی لئے کالعدم قرار دیئے ہیں کہ ان کے موجود رہتے ہوئے نوع انسان میں نفرت کے رجحانات تو پیدا ہو سکتے ہیں محبت کے جذبات نہیں اسلام کا یہ نظریہ کہ:

کلمہ من آدم و آدم من تراب

تم میں سے ہر ایک کا باپ آدم ہے اور آدم مٹی سے پیدا ہوئے تھے۔

ایک طرف اگر اس حقیقت کا آئینہ دار ہے کہ انسانوں میں اونچ نیچ اور ذات پات کے تصورات منافی اسلام ہیں تو دوسری طرف محبت نوع کا منہ بولتا ثبوت بھی ہے۔

خدا کی مخلوق ہونے کی حیثیت سے اپنے ابنائے نوع سے محبت، ایک مومن کی نظر میں کیسا کچھ مسلّم اور مؤکد امر ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگایئے کہ اسلام میں من حیث الکل تمام انواع مخلوقات کا احترام کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ مفید اور ضروری قسم کے جانوروں سے ہی نہیں وحوش وطیور، حشرات الارض حتیٰ کہ نجس اور پلید جانوروں تک سے حسن سلوک کی تعلیم دی گئی ہے

کسی ذی روح کو مزے لے لے کر اور تڑپا تڑپا کر مارنا جائز نہیں چاہے وہ کتنا ہی مہلک اور ضرر رساں کیوں نہ ہو۔ کسی حلال جانور کو خدا کا نام لے کر بھی کند چھری سے ذبح کرنا ممنوع ہے۔ کسی چوپائے کو بھوکا پیاسا رکھنا ناجائز ہے بلاضرورت کسی درخت کی شاخ تک کاٹنا پسندیدہ نہیں، یہاں تک کہ رسول خداؐ نے فرمایا اگر کتے خدا کی تخلیق میں ایک نوع نہ ہوتے تو میں ان سب کو قتل کرنے کا حکم دے دیتا۔ یہ ارشاد رسولؐ اور دیگر احکام اسلام جانوروں سے متعلق ہمیں یہی سکھاتے ہیں کہ خدا کی تمام مخلوقات کیلئے ہمارے دل میں احترام، محبت اور رحم کے جذبات پیدا ہوں اس کے بعد انسانوں سے محبت کرنا کتنا ضروری ہے کچھ زیادہ محتاج وضاحت نہیں رہتا۔

مومن کا سینہ حسد و بغض سے پاک ہوتا ہے:۔

محبت کا سب سے پہلا اثر جو مومن کا دل قبول کرتا ہے وہ حسد و بغض سے بیزاری ہے اس کے نور ایمان سے منور سینے میں بدی وبدخواہی کی تاریکی کیلئے کوئی گنجائش نہیں ہوتی وہ بہرحال خیر کا طالب ہوتا ہے۔ اپنے لئے بھی اور دوسرے تمام لوگوں کیلئے بھی وہ جو خدا سے بھی راضی ہوتا ہے اور مخلوق سے بھی محبت کرتا ہے اس کے عقیدہ رضا ومحبت میں آخر حسد و بغض کس طرف سے داخل ہو سکتے ہیں وہ کسی کو خوشحال وکامراں دیکھ کر حسد کرے تو کس بنیاد پر؟ کیا خدا کی تقسیم رزق پر معترض ہو یا انسان کی تباہی وبربادی کا خواہاں؟ مگر یہ دونوں کام اس کے دین وایمان سے مغایرت رکھتے ہیں۔ حضرت حسن بصریؒ کا قول ہے اے ابن آدم تو اپنے بھائی سے حسد کیوں کرتا ہے اللہ نے جو کچھ اسے دیا ہے اگر وہ اس کا فضل وکرم ہے تو ایسے آدمی پر حسد کیوں کرتا ہے جس کی عزت وتکریم کا خود خدا متمنی ہے اور اگر وہ خدا کا فضل وکرم نہیں کچھ اور ہے تو تجھے اس کے دوزخ کی طرف جانے پر حسد کیوں ہے" ابن سیرینؒ نے فرمایا میں نے دنیا کے مال ومتاع کو دیکھ کر کسی آدمی پر کبھی حسد نہیں کیا۔ اگر وہ اہل جنت میں سے ہے تو اس کی دنیوی آسودگی سے حسد کرنا فضول ہے کہ جنت کے مقابلے میں دنیا کی حقیقت ہی کیا ہے اور اگر وہ دوزخ کا ایندھن بننے والا ہے تو اس بدنصیب کے اس انجام کا خیال کر کے میں اس کی دنیا پر کیسے حسد کر سکتا ہوں؟ یہی حال بغض اور کینے کا ہے وہ اہل ایمان جو معاف کرنے میں لذت محسوس کرے جو انتقام پر قادر ہو اور بدلہ لینے کا حق رکھتا ہو مگر نہ لے جس کی نظر میں بغض رکھنا اللہ کی رحمت سے دور ہونا

ہو۔ وہ کسی کا بُرا کیوں چاہے گا رسول اللہؐ نے فرمایا، ہر سوموار اور جمعرات کو انسانوں کے اعمال بارگاہ الٰہی میں پیش کئے جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اسی دن ہر اس شخص کی مغفرت فرما دیتا ہے جو شرک نہ کرتا ہو سوائے ان دو حضرات کے جو باہم بغض میں مبتلا ہوں ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا فیصلہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے اعمال کا ران پر ہی رہنے دو تا آنکہ یہ آپ میں صلح کر لیں‘‘ آپ نے یہ بھی فرمایا اس وقت تک مومن کا ایمان مکمل نہیں ہوتا جب تک وہ اپنے بھائی کیلئے وہی شے پسند نہ کرے جسے وہ اپنے لئے پسند کرتا ہے اور جب تک اپنے بھائی کیلئے اس چیز کو ناگوار نہ سمجھنے لگے جسے وہ اپنے لئے ناگوار محسوس کرتا ہے۔‘‘ ان احادیث پاک میں جن محاسن کو سمویا گیا ہے کیا جذبہٗ محبت کے بغیر عملی زندگی میں انہیں فروغ دیا جا سکتا ہے اور یہ جذبہ انسان کے دل میں ایمان کی بدولت ہی پرورش پاتا ہے۔

ایثار و قربانی اہل ایمان کی خصوصیات ہے:۔

محبت کا بلند ترین درجہ یہ ہے کہ آدمی اپنی ذات پر اپنے بھائی کو ترجیح دے اور اس کی ضرورت کو مقدم سمجھے۔ وہ خود بھوکا پیاسا رہ لے لیکن اپنے بھائی کی شکم سیری کا اہتمام کرے، خود مشقت اٹھالے مگر اپنے بھائی کیلئے راحت کا سامان ہی مہیا کرے۔

مگر محبت کا یہ بلند کردار اسی وقت سامنے آتا ہے جب اس کے پیچھے ایمان کی طاقت موجود ہو۔ مکہ اور عرب کے دیگر مقامات سے خدا اور اس کے رسول پہ ایمان رکھنے والے مدینہ کی طرف ہجرت کرتے ہیں مال و اسباب سے لدے ہوئے نہیں بلکہ لٹے پٹے یہ راہ حق کے راہی جب مدینہ منورہ پہنچتے ہیں تو انصار انہیں خوش آمدید کہتے ہیں۔

اس وقت رسولؐ پاک نے مہاجرین کی بحالی کا مسئلہ اس طرح حل کیا کہ ایک ایک مہاجر کو ایک ایک انصاری کا بھائی قرار دے دیا۔ اس مواخات کے بعد انصار نے مہاجرین کو رہنے کیلئے اپنے مکانات دیئے کام کاج کیلئے اپنے وسائل مہیا کئے اپنی زمینوں اور اپنے اثاثوں کی پیش کش کی اور یک دل و یک جان ہو کر گزر بسر کرنے لگے۔ غور فرمایئے اس ایثار قربانی اور اخوت و محبت کی بنیاد کیا چیز تھی؟ کیا کوئی خون کا تعلق؟ نہیں۔ کیا رنگ، زبان اور علاقے کا اشتراک؟ نہیں یہ عرب اور بیرون عرب سے تعلق رکھنے والے لوگ جن میں سیاہ فام بھی تھے سفید فام بھی قریشی بھی

اور اوس و خزرج کے قبائل کے لوگ بھی کوئی شمالی عرب کا باشندہ تھا تو کوئی جنوبی عرب کا بعض یمنی اور حجازی تھے تو بعض رومی اور فارسی بہت سے غریب تھے اور کئی ایک امیر تاجر پیشہ بھی تھے کاشتکار بھی اور ایک بڑی تعداد اجرت پہ کام کرنے والوں کی بھی تھی۔ ان میں قدر مشترک صرف ایک چیز تھی......ایمان......اور اسی کے نتیجے میں اخلاص و ایثار کا یہ بے نظیر مظاہرہ ہوا کہ رسول اللہؐ نے فرما دیا تم سب بھائی بھائی ہو اور وہ بھائی بھائی بن گئے، حقیقتاً بھائی دنیا کے بھائیوں سے زیادہ گہرے اور ایثار پیشہ بھائی ہر ایک محبت کا پیکر اور اخوت کا مجسمہ حضرت عبد الرحمٰنؓ بن عوف فرماتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے میرے اور سعدؓ بن ربیع خزرجی کے درمیان تعلق اخوت قائم کر دیا۔ سعد مجھے گھر لے گیا اور کہا میں انصار میں سب سے زیادہ مالدار ہوں۔ یہ لیجئے میرا نصف مال حاضر ہے اور دیکھئے میری دو بیویاں ہیں ان میں سے جس کو پسند کرو۔ آپ کیلئے اس سے جدائی اختیار کر لیتا ہوں حلال ہونے پر آپ اس سے نکاح کر لیں اس مخلصانہ ایثار کا جواب حضرت عبد الرحمٰنؓ فرماتے ہیں میں نے یہ دیا کہ اللہ آپ کے گھر بار اور مال و دولت میں برکت دے یہ سب کچھ آپ اپنے ہی پاس رکھیں، مجھے صرف بازار کا راستہ بتا دیں تا کہ تجارت کر سکوں۔ اللہ تعالیٰ نے بھی انصار کے بے پناہ ایثار کو سراہتے ہوئے فرمایا:

وَالَّذِيْنَ تَبَوَّءُو الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِىْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ

(اور یہ اموال فے) ان لوگوں کیلئے بھی ہیں جو مہاجرین کی آمد سے پہلے ایمان لا کر دار الہجرت میں مقیم تھے یہ ان لوگوں سے محبت کرتے ہیں جو ہجرت کر کے ان کے پاس آئے ہیں اور جو کچھ بھی ان کو دے دیا جائے اس کی کوئی حاجت تک یہ اپنے دلوں میں محسوس نہیں کرتے اور اپنی ذات پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں خواہ اپنی جگہ خود محتاج ہوں۔

محبت کے زیر اثر بغض و کراہت کا وجود:۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ ہر انسان میں جذبہ محبت کے علاوہ بغض کا بھی کچھ نہ کچھ عنصر ضرور موجود ہوتا ہے اور وہ کسی نہ کسی صورت میں خروج کے راستے تلاش کرتا رہتا ہے ایمان نے جذبہ

محبت کو فروغ دینے کے ساتھ بغض و کراہت کے منفی جذبات کو بھی مثبت مقاصد کی تکمیل کیلئے استعمال کیا ہے اور یوں منفی جذبات کیلئے خود راستہ مہیا کر دیا ہے اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں فرماتا ہیں:

اِنَّ الشَّیْطان لَکُمْ عدوُ فَا تَّخِذُوْہُ عَدُوّاً. مزید فرمایا وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْ اُیقَا تِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ الطَّاغُوتِ فَقَا تِلُوْا اَوْلِیَآ ءَ الیشَّطَان.

''شیطان تمہارا دشمن ہے اسے دشمن ہی سمجھو اور جن لوگوں نے کفر کا راستہ اختیار کیا ہے وہ طاغوت کی راہ میں لڑتے ہیں ان شیطان کے ساتھیوں سے خوب جنگ اور قتال کرو''۔

مطلب یہ ہے کہ اگر کسی کے خلاف بغض رکھنا ہے تو شیطان سے رکھو، اس کے حواریوں سے رکھو اور ان سے جنگ بھی کرو لیکن کسی خدا کے پرستار اور صداقت کے علمبردار سے نہیں یہاں یہاں امر واضح رہے کہ شیطان یا اس کے کسی پیرو سے بھی بغض بحیثیت ایک شخصیت کے جائز نہیں ن ہ کسی عصبیت کے زیر اثر درست ہے۔ بغض اس کی گمراہی وضلالت سے، ہو اس کے دجل وفریب سے ہو، وہ راہ راست سے روکے اور حق سے منحرف کرے تو پھر ہو، یہی مفہوم ہے اس حدیث نبوی کا جس میں آپؐ فرماتے ہیں جس نے اللہ کیلئے محبت کی اللہ کیلئے بغض رکھا۔ اللہ کے لئے دیا اور اللہ کیلئے روکا اس نے اپنے ایمان کی تکمیل کر لی۔

مذکورہ بالا گزارشات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ عقیدہ اسلام پہ ایمان رکھنے والا ہی دراصل اللہ اور اس کے رسولؐ سے محبت کرتا ہے اور اگر کسی چیز کی طرف سے اس کے دل میں کراہت پیدا ہوتی ہے یا کسی کے خلاف وہ بغض رکھتا ہے تو وہ بھی یا تو رحمت وشفقت کی ہی بنا پر ہوتا ہے یا شیطان جیسی خیر سے یکسر عاری مخلوق سے متعلق، محبت کا یہ وسیع مفہوم صرف ایمان کا پیدا کردہ ہے اور آدمی کے ایمان کی دلیل بھی۔ سچ فرمایا رسول اللہؐ نے اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے تم ہرگز جنت میں داخل نہ ہو گے جب تک با ایمان نہ بن جاؤ اور تم کبھی با ایمان نہیں بن سکتے جب تک آپس میں محبت نہ کرو۔

*****

ایمان اور استقامت

مومن کا معاملہ بھی عجیب ہے کہ ہر صورت حال اس کیلئے اپنے دامن میں بھلائی رکھتی ہے اور یہ صرف مومن ہی کا خاصہ ہے اگر وہ خوشحال ہوتا ہے تو شکر کرتا ہے جو اس کیلئے سراپا خیر ہے اور اگر بدحالی ومصیبت سے دوچار ہو تو صبر کرتا ہے اور یہ ''صبر'' بھی اس کیلئے بہتر ہے۔ فرمان رسولؐ: امید، رضا، سکون قلب اور محبت، ایمان کے وہ پسندیدہ ثمرات ہیں جن سے ہر صاحب ایمان مستفید ہوتا ہے، اور جو معرکہ حیات کے مصائب وآلام سے پُر اور صبر آزما لمحات میں خاص طور پر مومن کے بہترین ہتھیار سمجھے گئے ہیں ان ہتھیاروں کی مستقل ضرورت کا احساس اس وقت اور بھی شدید ہو جاتا ہے جب دنیا کی حقیقت انسان پہ آشکار ہوتی ہے۔ یہاں دنیا میں حادثات ناگزیر ہیں شدائد ومحن سے ساکنان ارض دوچار ہوتے رہتے ہیں کتنے لوگ ہیں جو نامساعد حالات کے سامنے بے بس ہو جاتے ہیں اور طویل جدوجہد بھی کسی طرح مثمر نہیں ہوتی بعض کے عزیز انتقال کر جاتے ہیں بعض کو کوئی خطرناک بیماری لاحق ہوتی ہے اور بہتیرے بدنصیب وہ ہیں جن کی عمر بھر کی پونجی لُٹ جاتی ہے۔ الغرض اس دنیا میں بہت کچھ ہوتا رہتا ہے جو طبع انسان پر ناقابل بیان حد تک ناگوار گزرتا ہے اور اس کی امنگوں اور آرزوں کو خاک میں ملا کر رکھ دیتا ہے جیسا کہ شاعر نے کہا ہے ؎

جُعِلتِ علی کدروانت تریدھا   صفو اَمن الالآم والا کدار!!

وَمکلفُ الایام ضدّ طب عھا   متطلب فی الماءِ جذوۃ نار

(ترجمہ) دُنیا ایک مقام تکدر ہے لیکن اے انسان تو اسے غموں اور کدورتوں سے پاک دیکھنا چاہتا ہے: یہ کبھی نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ اس کے مزاج کے برعکس ہے اور انسان یہ خواہش کر کے گویا پانی کے ذخیرے سے آگ کا انگارہ طلب کرتا ہے۔

حیات دنیا میں مصائب وآلام کا وجود اللہ کی سنت کے عین مطابق ہے اور یہ سب انسانوں سے متعلق ہے لیکن اللہ کے پیغمبر گردش روزگار کا خاص طور پر شکار ہوئے ہیں جب وہ لوگوں کو اللہ کی بندگی کی طرف بلاتے ہیں اور خواہش نفس کی پیروی سے روکتے ہیں تو کفر کے علمبردار اور نفس

کے بندے ان کی جان کے دشمن بن جاتے ہیں پھر جب یہ صاحبان رشد وہدایت معروف کا حکم دینے اور منکرات کا استیصال کرنے کیلئے جدوجہد کرتے ہیں تو آہستہ آہستہ تمام طاغوتی طاقتیں ان کے خون کی پیاسی بن جاتی ہیں اور اس طرح جانگسل آزمائشوں کا ایک دور شروع ہو جاتا ہے جس سے اہل حق کو گزرنا پڑتا ہے قصہ آدم وابلیس، کشمکش ابراہیم ونمرود، معرکہ موسیٰ وفرعون اور محاذ بہ محمدؐ وابوجہل، معرکہ حق وباطل کے مختلف مظاہر ہیں۔

وَكَذٰلِکَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا (الانعام؛ ۱۱۲)

''اور ہم نے ہمیشہ اسی طرح شیطان انسانوں اور شیطان جنوں کو ہر نبی کا دشمن بنایا ہے جو ایک دوسرے پر خوش آئند باتیں دھوکے اور فریب کے طور پر القاء کرتے رہے ہیں''۔

انبیاء آزمائشوں کی بھٹی میں ڈالے گئے اور ان کے جانشینوں کے ساتھ بھی سلوک ہوا اور ہر وہ شخص جو ان کی بتائی ہوئی راہ حق پر گامزن رہا۔ دین حق کے باغیوں نے انہیں تکلیفیں پہنچانے میں کوئی وقیقہ فروگزاشت نہکیا۔ رسول اللہؐ سے پوچھا گیا مصیبتوں کے پہاڑ کن انسانوں پر ٹوٹتے ہیں؟ آپ نے ارشاد فرمایا انبیاء ورسل پر پھر وہ جو پیروی حق وصداقت میں ان سے زیادہ قریب ہوں پھر وہ جو ان کے مشابہ ہوں یاد رکھو آدمی پر یہ ابتلا اس کے دین کے مطابق آتے ہیں اگر وہ پیروی دین میں زیادہ سخت ہو تو اس کی آزمائشیں بھی سخت ہتی ہیں اور اگر اس کا دین کمزور ہو تو اس پر نازل ہونے والی مصیبتیں بھی معمولی ہونگی۔

اہل ایمان کی استقامت کی مثالیں:۔

سامریہ کی اسرائیلی ریاست کا جب اشوریوں کے ہاتھوں خاتمہ ہو گیا اور یروشلم کی یہودی ریاست کے سر پر تباہی کا طوفان کھڑا تھا تو یرمیاہ نبی نے اپنی قوم کو متنبہ کرنا شروع کر دیا کہ سنبھل جاؤ ورنہ تمہارا انجام سامریہ سے بھی بدتر ہوگا مگر قوم کی طرف سے ان کو جو جواب ملا وہ یہ تھا کہ ہر طرف سے ان پر لعنت اور پھٹکار کی بارش ہوئی، پیٹے گئے قید کیے گئے اور آخر میں رسی سے باندھ کر کیچڑ بھرے حوض میں لٹکا دیئے گئے تا کہ بھوک اور پیاس سے وہیں سوکھ سوکھ مرجائیں بایں ہمہ اللہ کے پیغامبر نے پیغام حق سنانے میں کوئی کوتاہی نہیں کی اور مخالفین کی ناقابل برداشت اذیتوں کے

مقابلے میں کمال صبر واستقامت کا مظاہرہ کیا مگر اس بد بخت قوم نے ان کی ایک نہ سنی۔

حضرت یحییٰؑ کے عہد کا یہودی فرمانروا ہیرودانیٹی یاس رومی تہذیب کے اثرات سے پوری طرح متاثر تھا اور اس کی وجہ سے سارے ملک میں فسق وفجور پھیل رہا تھا خود اس نے اپنے بھائی کی بیوی ہیرودیاس کو گھر میں ڈال رکھا تھا حضرت یحییٰؑ نے اس پر ہیرودیاس کو ملامت کی اور اس کی فاسقانہ حرکات کے خلاف آواز اٹھائی اس جرم میں ہیرود نے ان کو گرفتار کر کے جیل بھیج دیا مگر اس کی بیوی نے اس سزا کو کافی نہ سمجھا کیونکہ وہ جانتی تھی کہ یحییٰؑ جو اخلاقی روح قوم میں پھونک رہے ہیں وہ لوگوں کی نگاہ میں اس جیسی عورتوں کی تذلیل کا باعث بن رہی ہے چنانچہ وہ ان کی جان کے درپے ہو گئی۔ آخر کار ہیرود کی سالگرہ کے جشن میں اس نے وہ موقع پالیا جس کی وہ تاک میں تھی جشن کی تقریب میں اس کی بیٹی نے رقص پیش کیا جس پر خوش ہو کر ہیرود نے کہا مانگ کیا مانگتی ہے بیٹی نے فاحشہ ماں سے پوچھا کیا مانگوں ماں نے کہا یحییٰ کا سر مانگ لے چنانچہ اس نے کہا مجھے یوحنا بپتسمہ دینے والے کا سر ایک تھال میں رکھوا کر ابھی منگوا دیجئے اس نے فوراً حضرت یحییٰ کا سر قلم کرنے کا حکم دیا اور رقاصہ کی نذر کر دیا یہ وہ سلوک تھا جو یہود نے اپنے اس جلیل القدر پیغمبر کیساتھ کیا اور اسارت وقتل کے مقابلے میں وہ ثبات واستقامت تھی جو ہمیں سیدنا یحییٰ کی ذات میں مجسم ملتی ہے۔

نبی آخر الزمان حضرت محمدؐ کی ساری زندگی یوں تو استقامت کی جیتی جاگتی مثال ہے تاہم ابتلاء وآزمائش کا وہ دور جس سے آپ منصب رسالت پر فائز ہونے کے بعد گزرے اور جو مکی زندگی کے آخری سالوں میں شدت اور سنگینی کے اعتبار سے دور عروج تھا اس کی مثال پوری انسانی تاریخ میں نہیں ملتی ہماری مراد شعب ابی طالب میں آل ہاشم کے محصور ہونے سے ہے آدمی بسا اوقات تنہا ایک مصیبت کو برداشت کر لیتا ہے لیکن جب وہ مصیبت ایک شخص کی وجہ سے پورے خاندان اور برادری پر ٹوٹ رہی ہو اور ابتلاء کا سلسلہ دو چار دس دن تک نہیں بلکہ سالوں تک پھیلتا ہوا نظر آئے تو برادری کے مختلف المزاج اصحاب کا ردعمل دیکھ کر بڑے بڑے دل گردے کے انسان بھی ہل جاتے ہیں اور ان کے پائے ثبات میں لغزش آجاتی ہے لیکن رسول اللہؐ کی استقامت اسی معنیٰ میں بے مثال ہے کہ آپؐ آل ہاشم سمیت پورے تین برس اس گھاٹی میں

رہے۔اس دوران صحابہ کا بیان ہے کہ ہم ببول کے پتیاں کھا کر وقت گزارا کرتے کبھی کوئی سوکھا چمڑا ہاتھ لگتا تو اسے پانی میں بھگو کر اور آگ پر بھوننے کے بعد کھالیتے چھوٹے بچے بھوک سے نڈھال ہو کر روتے تو دور دور تک ان کے رونے کی آواز سنائی دیتی اور بے درد قریش اس آہ و بکا کو سن کر خوش ہوتے اپنے رفقاء واحباب کو یوں تکلیف میں مبتلا دیکھ کر رسول مقبول کے دل پر جو کچھ گذرتی ہوگی اس کا اندازہ بآسانی کیا جاسکتا ہے مگر آپ ان تمام صعوبتوں کا مردانہ وار مقابلہ کرتے رہے۔مصیبت اور مجھوری کا یہ دور ختم ہوا ہی تھا کہ ابو طالب اور ام المومنین حضرت خدیجہؓ کا چند ہی دنوں میں یکے بعد دیگرے انتقال ہو گیا۔ان دونوں ہستیوں کا اٹھنا تھا کہ کفار قریش اذیت رسانی میں کچھ زیادہ ہی دلیر ہو گئے اور فقر و فاقہ کا عالم جو پہلے ہی نا گفتنی تھا اس میں اور بھی شدت آ گئی انہیں المناک حالات کا ذکر کرتے ہوئے رسول اکرمؐ نے فرمایا مجھے اللہ کی اطاعت کرنے کی بنا پر اس قدر خوفزدہ کیا گیا کہ اتنا خوف کسی دوسرے کو نہیں دلایا گیا اور اللہ کے احکام بجا لانے کی وجہ سے اس قدر اذیت پہنچائی گئی کہ اتنی اذیت میں کسی دوسرے کو کبھی مبتلا نہیں کیا گیا اور مجھ پر ایسے سخت حالات آئے کہ متواتر تیس دن تک میرے اور بلالؓ کیلئے کھانے کو کوئی چیز نہ ہوتی کوئی چیز جسے جاندار کھا سکے سوائے اس قلیل مقدار کے جو بلال زیر بغل رکھتے (ترمذی بروایت انس) ظلم و ستم کا نشانہ تنہا رسول پاکؐ ہی نہ تھے بلکہ اس دور میں کم وبیش ہر مسلمان پہ مشق ستم ہوئی اور نہایت کڑی آزمائشوں سے گزرنا پڑا سیدنا بلالؓ امیہ بن خلف کے غلام تھے جب ٹھیک دوپہر ہو جاتی تو عرب کی تپتی ریت پر یہ ظالم آپ کو لٹا دیتا اور پتھر کی چٹان سینہ پر رکھ دیتا تا کہ جنبش نہ کرنے پائیں پھر ان سے کہتا کہ اسلام سے منہ موڑ لو ورنہ یوں ہی گھٹ گھٹ کر مرجانا ہوگا لیکن حضرت بلالؓ کی زبان حق ترجمان سے صرف ایک ہی بات نکلتی اَحد اَحد ھو اللہ اَحد۔

جب امیہ دیکھتا کہ ان کے پائے ثبات متزلزل نہیں ہو رہے تو گلے میں رسی ڈال کر اوباش جوانوں کے حوالے کر دیتا جو انہیں شہر کے اس سرے سے دوسرے سرے تک گھسیٹتے پھرتے حضرت خباب بن ارت قبیلہ بنی تمیم کے فرد تھے جاہلیت میں غلام بنا کر فروخت کر دیئے گئے انہوں نے اس وقت اسلام قبول کیا جب یہ مشکل چھ سات سعادت مند حلقہ بگوش اسلام ہوئے تھے قریش نے ان کو طرح طرح کی تکلیفیں دیں۔ایک دن کوئلے جلا کر زمین پر بچھائے اور ان پر

چت لٹا دیا۔ایک شخص چھاتی پر پاؤں رکھے رہا کہ کروٹ نہ بدلنے پائیں یہاں تک کہ کوئلے پیٹھ کے نیچے دب کر ٹھنڈے ہو گئے۔حضرت عمار ان کے والد یاسر اور والدہ سمیہ رضوان اللہ علیہم اجمعین پر بھی جور و جفا کے پہاڑ ٹوٹتے رہے۔حضرت عمارؓ کو قریش اس قدر مارتے کہ بے ہوش ہو جاتے حضرت یاسر کافروں کے ہاتھ سے اذیت اٹھاتے اٹھاتے ہلاک ہو گئے اور حضرت سمیہؓ وہ باشرف خاتون ہیں جنہوں نے سب سے پہلے خدا کی راہ میں جامِ شہادت نوش کیا ابوجہل نے اسلام لانے کے جرم میں انہیں برچھی مار کر شہید کر دیا تھا......اصحاب رسولؐ میں سے چند ایک کی استقامت کا یہ تذکرہ ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ پوری اسلامی تاریخ اہل ایمان کی استقامت سے مزین ہے صحابہ کرام کے بعد تابعین عظام، آئمہ اربعہ، محدثین اور دیگر بے شمار صلحائے امت کی زندگیاں اس امر کا واضح ثبوت ہیں کہ یہ صرف ایمان ہی ہے جو بندگان خدا کو انتہائی نامساعد حالات میں استقامت بخشتا ہے طاغوتی طاقتوں کے مقابلے میں بلند حوصلگی اور جرات سے ڈٹ جانے کی تعلیم دیتا ہے اور سنگ و آہن سے زیادہ مضبوط عزم و ہمت عطا کرتا ہے۔

منکرین خدا مصیبتوں سے زیادہ گھبراتے ہیں:۔

اس کے برعکس تجربہ اور مشاہدہ بتاتا ہے کہ سب سے زیادہ گھبرا جانے والے اور شدائد حیات کے سامنے جلد گھٹنے ٹیک دینے والے لوگ بالعموم وہ ہوتے ہیں جو خدا کو نہیں مانتے یا ریب وتشکیک کے مرض میں مبتلا ہوتے ہیں یہ لوگ نہ تو تقدیر کے قائل ہوتے ہیں کہ اس پر راضی ہو جائیں نہ خدا کو مانتے ہیں کہ اس کی حکمتوں پہ مطمئن ہوسکیں نہ انبیاء وصلحاء کی مصیبتوں بھری زندگی میں ان کیلئے کوئی نمونہ ہوتا ہے کہ جس سے انہیں صبر و ثبات کی رہنمائی مل سکے اور نہ حیات بعد الموت پر ایمان رکھتے ہیں کہ وہاں کی جزاء وسزا انہیں کچھ تسلی دے سکے۔ان کی مثال اس کشتی کی سی ہے جس کے پتوار اور بادبان گم ہو چکے ہوں اور سمندر کے تند و تیز اور سرکش تھپیڑے چار جانب سے اسے غرق کرنے کے درپے ہوں کیا اس کشتی کو غرق ہونے سے کوئی چیز بچا سکتی ہے اور کیا اسے ہر وقت غرق ہو جانے کا خوف لاحق نہ رہے گا بالکل اسی بے اطمینانی اور گھبراہٹ سے منکرین خدا ہر لحظہ دو چار رہتے ہیں۔

اہل ایمان کی استقامت اور اس کا ماخذ:۔

مومنین سب سے زیادہ صبر کرنے والے ہوتے ہیں اور ہر نوع کی مصیبتوں پر ثبات واستقامت کا بھرپور مظاہرہ کرتے ہیں اسکی ایک وجہ تو یہ ہے کہ وہ حیات دنیا کو حیات اُخریٰ کے مقابلے میں بہت حقیر سمجھتے ہیں اتنا حقیر کہ اس کے دردوالم کو خاطر ہی میں نہیں لاتے۔

قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى.

دوسری وجہ یہ ہے کہ مومن حیات دنیا کے بارے میں سنت اللہ کا واضح شعور رکھتا ہے وہ اچھی طرح سمجھتا ہے کہ دنیا میں انسان کو عقل وفکر اور ارادہ واختیار کی آزادی دیکر بھیجا ہی اس لئے گیا ہے کہ اس کی آزمائش کی جائے چنانچہ اسے مصائب کے نزول پر کوئی تعجب نہیں ہوتا البتہ اسے تعجب اس وقت ضرور ہوتا ہے جب دارالمحن میں دارالجزاء کی سی سہولتیں میسر آجاتی ہیں تیسری چیز جو اہل ایمان کو ثبات واستحکام عطا کرنے والی ہے وہ اپنے پیشرووں کے حالات ہیں وہ دیکھتے ہیں کہ صداقت کے علمبردار ہر دور میں ستائے جاتے رہے ہیں۔کون سا مکروفریب اور کون سی چال ہے جو اہل کفر نے ان کے خلاف نہیں چلی سیدنا ابراہیمؑ کو جلتی آگ کے شعلوں میں پھینک دیا گیا۔سیدنا زکریاؑ کو آرے سے چیر ڈالا گیا۔امام الانبیاء کو طائف کے بازار میں اس قدر لہولہان کیا گیا کہ آپؐ بار بار غش کھا کر زمین پر گر پڑتے تھے یہ خوفناک مظالم اور ان میں حضرات انبیاء کی مثالی استقامت اہل ایمان کی نظروں کے سامنے رہتی ہے اور ان کے پائے ثبات میں لغزش نہیں آنے دیتی۔

تقدیر پر ایمان، مومن کیلئے ابتلاء کو آسان بنادیتا ہے:۔

نازل ہونے والی ہر مصیبت کے بارے میں مومن یہ سمجھتا ہے کہ یہ کسی اندھی بہری طاقت کی طرف سے بے سوچے سمجھے پڑنے والی افتاد نہیں، بلکہ وہ قضائے مبرم اور نوشتۂ تقدیر ہے جو کسی کے ٹالے ٹل نہیں سکتا اور اس قضا کے پیچھے اس حکیم ودانا کا علم وارادہ کارفرما ہے جو بندے کی قوت وطاقت اور ابتلاء کی سختی وشدت کا خوب اندازہ رکھتا ہے جس کا ہر فیصلہ کمال درجہ کی حکمت پر منتج ہوتا ہے اور جس کی رحمت وشفقت اس کے قہر وغضب پر بہر حال غالب رہتی ہے دوران مصیبت

مومن کے ذہن میں یہ بات بھی برابر رہتی ہے کہ زندگی کی تلخیاں اور حادثات اس کیلئے قیمتی اسباق ہیں اور دین ودنیا کے نفع بخش تجربات بھی جو اس کے مزاج کو پختگی اور اس کے ایمان کو جلا بخشتے ہیں اور اس کے دل کا زنگ دور کر کے رکھ دیتے ہیں۔ رافعی نے کتنے بلیغ انداز میں بیان کیا ہے۔ ”انڈے کی سفیدی اور زردی کیلئے اس کا خول ایک قید خانہ ہی تو ہے لیکن اسی قید خانے میں سفیدی اور زردی کو مختلف سخت مراحل سے گزرنے کے بعد ایک حسین وجمیل چوزے کی شکل اختیار کرنی ہوتی ہے اب اگر انڈے کا سیال مواد ایک مدت معینہ کیلئے صبر نہ کرے تو دسترخوان شاہی کا وہ جزولذیذ جسے مرغ کہتے ہیں کس طرح وجود میں آسکتا ہے۔“ ٹھیک اسی طرح مومن اللہ کی تقدیر پر مکمل بھروسہ رکھتے ہوئے دنیا کی آزمائش کی ہر بھٹی سے گزر جاتا ہے اور آفات وحوادث روزگار کو زیادہ محسوس نہیں کرتا کیونکہ ساکن فردوس کی حیثیت سے نہایت حسین انجام اس کا مقدر ہوتا ہے۔

مصائب دنیا اہل ایمان کی نظر میں:۔

حضرت یوسفؑ کے سامنے بیک وقت دو مصیبتیں آئیں۔ایک کا تعلق دین سے تھا۔دوسری کا دنیا سے یعنی یا تو عزیز مصر کی بیوی کی ناجائز خواہش پوری کریں یا برسوں جیل میں رہیں اور مشقت وصعوبت کا سامنا کریں۔مگر یوسفؑ نے اپنے اللہ سے عرض کی

رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَيَّ مِمَّا يَدْعُوْنَنِيْ اِلَيْهِ. (یوسف:۳۳)

”میرے پروردگار! مجھے جیل خانے کی زندگی اس کام سے عزیز تر ہے جس کی طرف یہ لوگ مجھے بلاتے ہیں“۔

سلف میں سے ایک بزرگ نے فرمایا مجھ پر جب کوئی دنیاوی مصیبت آتی ہے مجھے احساس ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر تین احسانات کئے ہیں جن کا شکریہ ادا کرنا واجب ہے۔ پہلا احسان یہ کہ اس مصیبت کا تعلق میری دنیا سے ہے میرے دین سے نہیں کیونکہ دنیا کے نقصان کی کوئی بات نہیں مگر دین کا نقصان تو ناقابل تلافی نقصان ہے دوسرا احسان یہ کہ جو مصیبت آئی ہے اس سے بڑی مصیبت میں بھی اللہ تعالیٰ مبتلا کر سکتا تھا۔لیکن اللہ تعالیٰ نے مجھے اس سے بچالیا تیسرا احسان یہ کہ مصیبت پر صبر کرنے کا ثواب اللہ تعالیٰ میرے نامۂ اعمال میں لکھ دیتا ہے جو مجھے بہتر

حال ملنا ہے بنابریں کسی مصیبت پر رنج وغم کا اظہار کرنے کے بجائے اللہ کا شکرادا کرنا چاہیے۔

اسی طرح ایک اور مرد حق آگاہ سے منقول ہے کہ انہیں پاؤں میں کوئی تکلیف تھی۔ جب بھی شدید درد ہوتا تو وہ مسکرادیتے اور اِنا للہ وانا الیہ راجعون پڑھتے۔ ان سے کہا گیا کہ آپ کو اتنا سخت درد ہوتا ہے مگر آپ کراہتے تک نہین فرمانے لگے درد کے ثواب کی مٹھاس اس کی تکلیف کی تلخی کو بھلا دیتی ہے۔ حضرت عروہ بن زبیرؓ تابعین میں نہایت ممتاز مقام رکھتے تھے کہتے ہیں کہ ان کے ایک پاؤں کو ایسی بیماری لگ گئی کہ جس کی وجہ سے اطباء نے اسے بلا تاخیر کاٹنے کا حکم دے دیا تا کہ بیماری کے اثرات پنڈلی اور ران تک منتقل نہ ہو جائیں حضرت عروہؒ نے پاؤں کو بخوشی آرے کے نیچے رکھ دیا اس موقع پر ان کی خدمت میں پینے کیلئے ایک دوائی پیش کی گئی تا کہ ان کے حواس معطل ہو جائیں اور وہ قطع عضو کی تکلیف کو محسوس نہ کریں جب آپ کو دوائی کی خاصیت کا پتہ چلا تو آپؒ نے فرمایا میں نہیں سمجھتا کہ اللہ پر ایمان رکھنے والا شخص ایسی دوائی پی سکتا ہے جس کے نتیجے میں اس کا شعور معطل ہو جائے اور وہ کسی چیز کا ادراک نہ کر سکے حتیٰ کہ اللہ کا بھی۔ آیئے اور پاؤں کاٹ دیجئے۔ چنانچہ ٹخنے سے آپ کا پاؤں کاٹ دیا گیا اور آپ خاموشی سے سب کچھ دیکھتے رہے معمولی تکلیف کا بھی آپ نے اظہار نہ کیا۔ کرنا خدا کا اسی رات آپ کا بیٹا جسے آپ باقی تمام بیٹوں سے زیادہ عزیز رکھتے تھے چھت پر سے گرا اور جاں بحق ہو گیا۔ لوگ آپ کے پاس تعزیت کیلئے آئے تو آپ نے فرمایا یا اللہ تیرا شکر ہے میرے سات بیٹے ہیں تو نے صرف ایک لیا ہے اور باقی چھ میرے پاس رہنے دیئے۔ خود مجھے تو نے اے اللہ دو ہاتھ اور دو پاؤں دیئے تھے اور ان چار میں سے تین ابھی میرے پاس ہیں صرف ایک ہی کاٹا گیا ہے اگر تو نے میری یہ پیاری چیزیں لے لی ہیں تو دی بھی تو تو نے ہی تھیں۔ آزمائش تیری طرف سے آئی ہے تو عافیت سے بھی تو نے ہی نواز رکھا تھا۔

مذکورہ واقعات سے ایسے تو بہت سے حقائق واضح ہوتے ہیں تاہم چند ایک کی طرف اشارہ کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اولاً مومن متاع دنیا کے نقصان کو چنداں اہمیت نہیں دیتا ثانیاً وہ متوقع بڑی مصیبت کے پیش نظر موجودہ مصیبت پر بآسانی صبر کر لیتا ہے ثالثاً وہ اس اجر جزیل پر نگاہ رکھتا ہے جو مصیبت پر صبر کرنے والے کو اللہ کی طرف سے عطا ہو گا۔ جیسا کہ حدیث رسولؐ

میں ہے مسلمان کو جو بھی غم یا فکر لاحق ہوتا ہے اللہ تعالیٰ ان سب پریشانیوں اور مصیبتوں کو اس کو گناہوں کا کفارہ بنا دیتا ہے۔

ملحدین کا اعتراف حقیقت:۔

ایمان، انسان کو ثبات واستقامت کی جو طاقت عطا فرماتا ہے اس کا اعتراف وہ لوگ بھی کرنے پر مجبور ہوتے ہیں جو اپنے مادی نظاموں اور فلسفوں کے گن گاتے نہیں تھکتے۔ متعصب اشتراکیوں کو اعتراف کرنا پڑا کہ ان کا نظام دوسری عالمگیر جنگ میں لوگوں کو ڈٹ جانے اور ثابت قدمی دکھانے کا وہ مظاہرہ نہ کر سکا جو دین وایمان نے کیا چنانچہ انہیں حالات نے مجبور کر دیا کہ لوگوں کو وقتی طور پر دین فطرت کی طرف پلٹ جانے کی اجازت دے دیں تا کہ ان کے باطن کا وہ خلا پر ہو سکے جسے کوئی مادی وجدلی فلسفہ پر نہ کر سکا تھا

*****

تیسرا باب

اجتماعی زندگی پر ایمان کے اثرات

ایمان اور حیات اجتماعی

فرد اور معاشرہ کے مابین تعلق کی نوعیت خاصی پیچیدہ ہے اور کسی ایسی حد فاصل کا تعین آسان نہیں جو فرد اور معاشرہ کے حدود عمل کو واضح کر سکے اس لئے کہ جو چیز فرد پر اثر انداز ہوتی ہے وہی معاشرہ پر بھی اپنے اثرات مرتب کرتی ہے اور پھر معاشرہ ہے کیا؟ افراد کے مجموعہ ہی کا تو نام ہے افراد جن اعمال واخلاق اور جس سیرت وکردار کے حامل ہوں گے معاشرہ میں بھی وہی روح جاری وساری ہوگی اس تعلق کو اہم ایک مثال کے ذریعہ واضح کرتے ہیں، دیوار، اینٹیں چن کر تعمیر کی جاتی ہے اینٹیں اگر کچی ہوں گی تو دیوار بھی ناپختہ ہوگی اور اگر اینٹیں پختہ ہوں اور انہیں ایک دوسرے سے پیوست کرنے والا مواد یعنی ریت اور سیمنٹ کی مناسب مقدار سے مرکب ہو تو دیوار بھی یقیناً پختہ ہوگی۔

پس ایک بنیان مرصوص کی تعمیر کا خواب اس وقت تک شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکتا جب تک خوب مستحکم اور مضبوط اینٹیں موجود نہ ہوں۔ کسی معاشرے کی تعمیر میں افراد اینٹوں کا کام دیتے۔ ہیں گذشتہ مباحث میں ہم نے فرد کی زندگی پر ایمان کے اثرات کا ذکر کرتے ہوئے جو کچھ بیان کیا ہے اس کا مقصد بھی یہی ہے کہ معاشرہ کی اصلاح سے پہلے فرد کی اصلاح کا سامان کیا جائے اب اس پر ہم اتنا اضافہ اور کریں گے کہ کوئی فرد اگر انفرادی طور پر سکون قلب، نعمت ایمان اور محبت واستقامت کے اوصاف سے متصف ہو بھی جائے تو سعادت کے مرتبہ کمال سے محروم ہی رہتا ہے یہ مقام بلند ایک فرد کو حقیقتاً اسی وقت نصیب ہوتا ہے جب پورا اجتماعی ماحول نہ صرف ان صفات کیلئے سازگار ہو بلکہ انہیں پروان چڑھانے میں ممد ومعاون ہو۔

ایک اچھے معاشرے کی سب سے بڑی خوبی افراد کا باہمی ربط وضبط ہے اسی کے ذریعے افراد کے مابین محبت ویگانگت کے رشتے استوار ہوتے ہیں اور وہ ایک دوسرے کے دمساز بن کر رہتے ہیں نہ کوئی کسی پر زیادتی کرتا ہے اور نہ سنگدلانہ برتاؤ۔ بہترین اور سعادت مند معاشرہ

میں دولت سے بہرہ ور لوگ محروم طبقہ کو فراموش نہیں کرتے اور اثر و رسوخ اور قدرت وطاقت کے مالک کمزوروں کو نظر انداز نہیں کرتے بلکہ ان کی معاونت اور دستگیری کرتے ہیں۔

بدترین چیز جو کسی معاشرہ کو لاحق ہوتی ہے وہ انتشار وتشتت اور باہمی روابط کا فقدان ہے اور یہ صورت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب افراد خود غرضی کا شکار ہو جائیں وہ اپنی ذات اور اپنے مفادات کو تو یاد رکھیں مگر اپنے بھائی کا مطلق خیال نہ کریں بلکہ اسے اپنی اغراض کی بھینٹ چڑھانے سے بھی دریغ نہ کریں۔ اسی طرح وہ وقت بھی کسی معاشرہ کیلئے بہت برا وقت ہوتا ہے جب افراد اپنے حقوق کیلئے لڑیں مگر اپنے فرائض سے غافل ہوں نیز اپنے آپ کو بہت کچھ سمجھیں اور دوسری مخلوق خدا کو بنظر حقارت دیکھیں اس کے برعکس دوسری چیز جو اپنی قباحت میں متذکرہ الصدر سے کسی طرح بھی کم نہیں یہ ہے کہ انسان اپنی ذات کے احساس ہی سے یکسر محروم ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے جو شرف عطا کیا ہو جو قوت وطاقت اسے تفویض کی ہو اور جن انعامات سے اسے نوازا ہو وہ ان کا شعور اور ادراک ہی نہ رکھتا ہو یا ان صلاحیتوں کو مہمل اور معطل کر کے بیٹھ جائے تو یہ چیز بھی انسان کی شخصیت کو نقصان پہنچاتی ہے اور انسان مستقل طور پر کمزوری و دوں ہمتی کا شکار ہو جاتا ہے۔ لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ افراد معاشرہ کے مذکورہ بالا دونوں انتہا پسندانہ نظریات کے درمیان ایک ایسی حد وسط تلاش کی جائے تا کہ افراد اپنی ذات کا احساس بھی رکھیں اور اس کے ساتھ ساتھ دوسرے لوگوں کے حقوق و واجبات بھی تلف نہ ہوں یعنی معاشرہ بھی مستحکم بنیادوں پر قائم رہے اور فرد کی شخصیت کی نشوونما بھی صحیح انداز سے ہو سکے۔

ایسی حدِ وسط کا تعین کچھ، وضوابط کا مقتضی ہے جن کے بغیر تعلقات و معاملات میں استحکام پیدا نہیں ہو سکتا جن کے بغیر انسانی جبلّت عقل کے خلاف اور قوت وطاقت حق وصداقت کے خلاف اقدام کرنے سے باز نہیں رہ سکتی اور جن کے بغیر ذاتی منفعت کا جنون اجتماعی مصالح کے پیش نظر اپنی حدود سے تجاوز کر سکتا ہے ایسے اصول وضوابط یکسر اخلاقی بنیادیں رکھتے ہیں اور ان کا مصدر و ماخذ انسان کا قلب وضمیر ہوتا ہے۔

آئندہ صفحات میں ہم اس امر سے بحث کریں گے کہ معاشرے پر ایمان واخلاق کے کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں اور ایمان کے زیر اثر نشوونما پانے والے اخلاق کیونکر انسان کو ایک ایسی بلند سطح تک پہنچا دیتے ہیں جہاں تک مادی اخلاق کے علمبرداروں کی رسائی کسی طرح بھی ممکن نہیں۔

ایمان اور اجتماعی اخلاق

"ایمانداروں میں کامل ترین ایمان اس کا ہے جس کا اخلاق سب سے اچھا ہو" (حدیث رسولؐ)

کیا طبیعت وجبلّت انسان کی اجتماعی زندگی کی رہنمائی کیلئے کافی ہے:۔

جب ہم حیوانات کی زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ انہیں اپنی انفرادی واجتماعی دونوں قسم کی زندگی کیلئے محض جبلّی رہنمائی کافی ہے۔ چیونٹیوں یا شہد کی مکھیوں کو دیکھئے کتنے حیرت انگیز طریقے سے یہ حشرات اپنا رزق حاصل کرتے ہیں اور آنے والے وقت کیلئے اس کے مناسب ذخیرہ کا بھی اہتمام کرتے ہیں ان کا ہر فرد ایک نظم کا پابند ہوتا ہے اور اپنا اپنا فرض...... دوسرے افراد کے فرائض میں رکاوٹ پیدا کئے بغیر بجا لاتا ہے۔ یہی حال دوسرے جانوروں کا بھی ہے پرندوں کے اڑتے ہوئے غول، ڈھور ڈنگروں اور مویشیوں کے ریوڑ، جنگلات میں درندوں کی منظّم زندگی اور سمندروں کی تہوں میں مچھلیوں اور دوسری بے شمار انواع حیوانات کی اجتماعی زندگی۔ اس امر کا واضح ثبوت ہے کہ حیوانات کا اجتماع ان کی فطری وجبلّی رہنمائی کے تابع ہوتا ہے۔

لیکن انسانوں کا معاملہ ان سے یکسر مختلف ہے۔ جبلّی کے اعتبار سے حیات انسانی اپنے اندر متعدد پہلو رکھتی ہے ایک فرد کی حیثیت سے اس کے اندر جذبہ انانیت موجزن ہوتا ہے جو اسے اپنی ذات سے غیر معمولی محبت پر ابھارتا ہے مگر اسی جبلّت کا دوسرا مظہر یہ بھی ہے کہ وہ بنی نوع انسان سے کٹ کر زندہ رہنا گوارا نہیں کرتا۔ ابنائے جنس کے درمیان رہ کر وہ اپنی فطری صلاحیتوں کو نشوونما دیتا ہے اور اسی وجہ سے وہ دوسرے انسانوں کیلئے بڑے سے بڑا ایثار کرنے پر بھی تیار ہو جاتا ہے۔

برطانوی فلسفی برٹرنڈ رسل نے کہا ہے "انسان کے جذبات وخواہشات کا معاملہ بڑا پیچیدہ ہے اور اس پیچیدگی سے نت نئی مشکلات پیدا ہوتی ہیں اس کی زندگی نہ تو صرف اجتماعی رنگ لئے ہوئے ہے جیسے چیونٹیوں اور شہد کی مکھیوں کی زندگی اور نہ صرف انفرادی رنگ جیسے شیر ببر اور چیتے کی زندگی اس کی حیات کا کچھ حصّہ اجتماعیت آشنا ہے جبکہ کچھ حصہ انفرادیت پسندانہ۔ اس کی طبیعت میں حیات اجتماعیہ کی میلان کا پتہ اس سے چلتا ہے کہ خلوت وتنہائی کو بسا اوقات انسان

ایک شدید عقوبت خیال کرتا ہے۔ دوسری طرف زندگی کا انفرادی رنگ بھی اسے محبوب ہوتا ہے جب بعض خاص امور و مفادات اس کے داعی ہوں۔ بنابریں ہمیں کچھ اخلاقی حدود و قیود وضع کرنے ہوں گے تاکہ تصرف و اختیار کے دوائر متعین ہو سکیں۔

آپ کا کیا خیال ہے اخلاق کے وہ صحیح حدود و قیود اور قواعد و ضوابط کون وضع کرسکتا ہے؟ اور کیا چیز ٹھیک ان کے مطابق حیات انسان کی گاڑی کو چلا سکتی ہے؟ کیا یہ کام قانون کرسکتا ہے یا کوئی فلسفہ اخلاق؟ یا پھر دین و ایمان؟ ہم کوشش کرتے ہیں کہ ان تینوں کی حقیقت پر کچھ روشنی ڈالیں۔

تنہا قانون انسانی زندگی کو مضبوط نہیں کرسکتا:۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ قانون ایک طاقت ہے اور اجتماعی زندگی کا نظام چلانے کیلئے ناگزیر ہے لیکن انسانی زندگی پر پوری طرح یہ اس لئے حاوی نہیں کہ اس کا تعلق صرف ظاہر سے ہوتا ہے باطن سے نہیں نیز یہ امور عامہ سے بحث کرتا ہے اور خاص حالات کا اس میں لحاظ نہیں رکھا جاتا۔ پھر قانون میں یہ سقم بھی ہے کہ وہ مجرم کو سزا دیتا ہے مگر محسن اور نکوکار کے صلہ کا کوئی اہتمام نہیں کرتا علاوہ ازیں قانون کی گرفت سے لوگ حیلے بہانے کے ذریعے بچ جاتے ہیں اور قانون میں یہ صلاحیت نہیں ہوتی کہ مجرمانہ ذہنیت کا کماحقہ، تعاقب کرسکے پس جب جرم کے سدباب میں، قانون عاجز سا نظر آتا ہے تو عمل صالح اور امور خیر و فلاح کی ترغیب میں تو اس کا عجز اور بھی نمایاں ہونا چاہیے قانون میں عدل و انصاف اور حق و صداقت سے زیادہ سے زیادہ مطابقت پیدا کرنے کے باوجود اس میں ایسی کوئی ذاتی قوت پیدا نہیں ہوتی جو لوگوں سے اس کی پابندی کرا سکے الّا یہ کہ حکومت کی طاقت اسکے پیچھے ہو اور جہاں تک حکومت کی طاقت کا سوال ہے اس سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ یہ ہر حال میں ظلم کے استیصال اور عدل کے فروغ دینے کیلئے ہی کوشاں رہے گی کیونکہ ارباب حکومت بھی انسان ہی ہوتے ہیں۔ جنہیں نشۂ حکمرانی اکثر و بیشتر راہ راست سے بھٹکا دیتا ہے چنانچہ جب وہ قانون سازی کرتے ہیں تو اپنے مفادات کو تحفظ دیتے ہیں اور اپنے خیالات و مفادات کو اس میں سمونے کی کوشش کرتے ہیں اور یہ معلوم ہے کہ کوئی انسان بھی اس قابل نہیں ہوتا کہ زندگی کے جملہ پہلوؤں پر اس کی نظر پوری جامعیت کے ساتھ پڑتی ہو۔ اس کے خیالات و نظریات تمام تر صحیح اور حقائق پر مبنی ہوں اور اپنی خواہشات و مفادات سے بے تعلق

رہتے ہوئے وہ مکمل غیر جانبداری کے ساتھ قانون وضع کرسکے پس جو قانون یہ بنیادی کمزوریاں اپنے اندر رکھتا ہو کون انسان اور کون معاشرہ اس پر مطمئن ہو سکتا ہے اور اپنی پوری زندگی کو اس کے تسلط میں دینے کیلئے تیار بھی ہو۔

فلسفہ اخلاق بھی کافی نہیں:۔

یہی حال فلسفہ اخلاق کا بھی ہے۔ کوئی اخلاقی فلسفہ معدودے چند افراد کو تو اپنی طرف مائل کرسکتا ہے پورے معاشرے کی توجہ اپنی طرف مبذول نہیں کرسکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر فلسفی کا اپنا فلسفہ اخلاق ہوتا ہے۔ اب لوگ کس کی پیروی کریں پھر سوال یہ ہے کہ ان میں سے کسی فلسفہ کے پیرو کی جزا کیا ہے؟ کیا عقل و دل اسی پر مطمئن ہو جاتے ہیں یا وہ محض ایک سراب ہے جسے پانی سمجھ کر پیاسا اس کی طرف لپکتا ہے۔ اس نامعلوم سپاہی کی کیا جزا ہے جو سب کی خدمت کیلئے کام کرتا ہے حالانکہ اسے نہ کوئی دیکھتا ہے نہ جانتا ہے اور اسے بدلہ دینے کی کسی کو فکر نہیں اپنی قوم اور اپنے خاندان کیلئے جان کی قربانی پیش کرنے والے کی کیا جزا ہے جو ان کا دفاع کرتے ہوئے لڑتا اور مظلومیت کی موت مرتا ہے۔ یہاں جس راحت ضمیر کا فلسفہ اخلاق کے علمبردار ذکر کرتے ہیں اس کا کوئی وجود بھی ہے؟ دوسری طرف ساری عمر ظلم و ستم روا رکھنے والے کی کیا سزا ہے؟ اور وہ جو دل کی معمولی کھٹک کے بغیر من مانیاں کرتا ہے اس کیلئے اس بے قید اور بے لگام زندگی پر کوئی تعزیر بھی ہے؟

ہم نے مندرجہ بالا سطور میں جس چیز کو مسترد کیا ہے وہ فلسفیوں کے تصورات اخلاق ہیں لیکن جہاں تک دین و مذہب کے بیان کردہ محاسن اخلاق کا تعلق ہے ان کی اہمیت سے کس کو انکار ہو سکتا ہے؟ وہ ترقی یافتہ فرد کی بنیاد اور مہذب معاشرے کی جان ہوتے ہیں۔ ان کے بغیر زندگی، زندگی نہیں رہتی قرآن میں نبی آخر الزماںؐ کی زیادہ سے زیادہ جو تعریف کی گئی ہے اس کی بنیاد یہی اخلاق ہے۔ ”وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٌ“ اور خود رسول پاک نے اپنے پیغام ہدایت کو چند الفاظ میں یوں سمویا ہے۔

اِنَّمَا بُعِثْتُ لِاُ تِمّم مَکَارِمَ الْاَخْلَاقِ

میرا مقصد بعثت یہ ہے کہ مکارم اخلاق کی تکمیل کروں

ایک اور حدیث نبویؐ میں ہے۔

اَكْمَلُ الْمُومِنِيْنَ اِيْمَا نًا اَحْسَنُهُمْ خُلُقًا.

اہل ایمان میں سب سے زیادہ مکمل ایمان اس کا ہے جس کا اخلاق سب سے اچھا ہے۔

ان آیات واحادیث سے دین میں اخلاق کی اہمیت اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے۔

دین، اخلاق کی طرف محض دعوت دینے پر ہی اکتفا نہیں کرتا بلکہ وہ اخلاق کی بنیاد پر اصول وضوابط وضع کرتا ہے۔ حدود اخلاق کی نشاندہی کرتا ہے۔ زندگی کی جزئیات تک کیلئے اخلاقی نمونوں کے انبار لگا دیتا ہے اور ان پر مستقل مزاجی کے ساتھ قائم رہنے کی تلقین کرتا ہے اسے اصول اخلاق سے انحراف قطعاً گوارا نہیں ہوتا۔ وہ واضح طور پر بتاتا ہے کہ انحراف کرو گے تو دنیا وآخرت میں یہ سزا ملے گی اور اصول اخلاق کی پاسداری پر دونوں جہانوں میں یہ جزا ملے گی اس سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ دین کے بغیر تکمیل اخلاق ممکن نہیں اور اخلاق کے بغیر کسی قانون کی کوئی قدر وقیمت نہیں۔

عقیدہ وایمان:۔

معاشرتی واجتماعی زندگی کیلئے جن اصول اخلاق کی ضرورت ہوتی ہے گذشتہ سطور میں ثابت کیا جاچکا ہے کہ وہ نہ تو انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین میں ملتے ہیں اور نہ فلاسفہ کی پر پیچ بحثیں ان تک رہنمائی کرتی ہیں ان کا سراغ اگر کہیں ملتا ہے تو دامن ایمان میں ملتا ہے ایمان اس بات کی تعلیم دیتا ہے کہ حیات دنیا کا مقصود خواہشات نفس کی تکمیل نہیں نہ شکم پروری اور لذت کام ودہن کا حصول، انسانی زندگی کی غایت ہے۔ کسی قسم کے تعصب کو بھی وہ انسان کا نصب العین نہیں بننے دیتا اور مکر وفریب اور فتنہ وفساد کی آلائشوں سے بھی انسانی زندگی کو پاک دیکھنا چاہتا ہے ایمان جو مقصدِ حیات انسان کے سامنے رکھتا ہے۔ وہ نہایت ارفع واعلیٰ مقصد ہے یعنی اللہ سے قریب ہونا اس کے ضابطوں کی پابندی کرنا اور اس کی خوشنودی کیلئے تگ ودو کرنا اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں فرماتا ہے۔

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ط ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاللّٰهُ

عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ. قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِنْ ذٰلِكُمْ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَاَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌ بِالْعِبَادِ ه اَلَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اِنَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ. اَلصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْمُنْفِقِيْنَ وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ. (آل عمران: ۱۴ تا ۱۷)

"لوگوں کیلئے مرغوبات نفس...... عورتیں، بیٹے سونے چاندی کے ڈھیر، چیدہ گھوڑے، مویشی اور زرعی زمینیں بڑی خوش آیند بنادی گئی ہیں مگر یہ سب سامان دنیا کی چندروزہ زندگی کے ہیں حقیقت میں جو بہتر ٹھکانا ہے وہ تو اللہ کے پاس ہے۔ کہو میں تمہیں بتاؤں کہ ان سے زیادہ اچھی چیز کیا ہے جو لوگ تقویٰ کی روش اختیار کریں ان کیلئے ان کے رب کے پاس باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی وہاں انہیں ہیشگی کی زندگی حاصل ہو گی۔ پاکیزہ بیویاں ان کی رفیق ہوں گی اور اللہ کی رضا سے وہ سرفراز ہوں گے۔ اللہ اپنے بندوں کے رویے پر گہری نظر رکھتا ہے یہ وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں مالک ہم ایمان لائے ہماری خطاؤں سے درگزر فرما اور ہمیں آتش دوزخ سے بچالے یہ لوگ صبر کرنے والے ہیں راستباز ہیں فرمانبردار اور فیاض ہیں اور رات کی آخری گھڑیوں میں اللہ سے مغفرت کی دعائیں مانگا کرتے ہیں"۔

ان آیات میں جن اوصاف کی نشاندہی کی ہے وہ دراصل ثمرات ہیں اس اخلاق کے جو ایمان کے زیر اثر نشوونما پاتا ہے اور جس سے مسلم معاشرہ کا ہر فرد متصف ہوتا ہے پس محاسن اخلاق سے ہر فرد کا مزین ہونا گویا بہترین معاشرہ کی بنیادوں کا مضبوط ومستحکم ہونا ہے۔

اخلاق الٰہی کو اپنے اندر پیدا کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ انسان مقام الوہیت پر فائز ہو سکے یہ چیز نہ مطلوب ہے نہ ممکن۔ مقصود صرف یہ ہے کہ انسان حیوانیت کی سطح سے بلند ہو جائے اور حضرت حق کے مبدا فیض سے اخذ واستفادہ کی مسلسل کوشش کرتا رہے۔ اللہ تعالیٰ علیم وحکیم ہے انسان کو بھی چاہیے کہ علم وحکمت کے موتیوں سے اپنے دامن کو بھرنے کی کوشش کرے۔ اللہ تعالیٰ روف ورحیم ہے انسان بھی اپنے اندر جذبہ رافت ورحمت پیدا کرے اللہ تعالیٰ غنی وکریم ہے انسان بھی اپنی طاقت کے مطابق غنی وکریم ے اوصاف سے متصف ہو۔ اللہ صبور وحلیم ہیں انسان بھی

مقدور بھر حلم وصبر سے کام لے۔ اللہ تعالیٰ جبار ومتکبر ہے انسان بھی طاغوتی طاقتوں کے مقابلے میں کمزور اور دوں ہمت ثابت نہ ہو اور دنی الاخلاق اور بداعمال قسم کے لوگوں سے مرعوب ومتاثر نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کی ایک بڑی صفت یہ ہے کہ وہ بڑا زبردست اور انتہائی سخت گیر ہے انسان کو بھی چاہیے کہ وہ کفار ومشرکین کیلئے بڑا شدید اور مفسدین کی راہ روکنے والا ہو۔ اللہ تعالیٰ شکر کی قدر کرنیوالا اور خطا کاروں کو معاف فرمانے والا ہے انسان کا بھی کام یہ ہونا چاہیے کہ وہ حسن سلوک کرنے والوں کا قدردان ہو اور معذرت چاہنے والوں سے درگزر کرے۔ اللہ تعالیٰ کبھی راہ راستے انحراف نہیں فرماتا انسان کا بھی فرض ہے کہ وہ ہمیشہ جادہ مستقیم پر گامزن رہے اللہ تعالیٰ کی ہر صفت شان کمال رکھتی ہے اور وہ ذات ہر عیب سے پاک اور ہر نقص سے منزہ ہے۔ لہٰذا انسان کیلئے ضروری ہے کہ وہ بھی اپنی زندگی کو نقائص اور عیوب سے پاک کرنے کی زیادہ سے زیادہ کوشش کرے۔

اب فرمایئے کہ جس معاشرے کے افراد کے سامنے یہ اخلاق الٰہی ہوں کیا ان کے اندر کوئی خرابی یا بگاڑ رونما ہوسکتا ہے اور کیا ان کی زندگی کا کوئی گوشہ ایسا بھی ہوسکتا ہے جو نور حق سے منور نہ ہو اور نفوس طبائع انسانی کیلئے اخلاق اللہ سے زیادہ موثر کوئی اور چیز بھی ہے۔ جس کی تاثیر کی انہیں حاجت ہو اور جس کیلئے انہیں دائرہ دین وایمان سے باہر قدم رکھنا پڑے؟ ظاہر ہے کہ ایسی کسی چیز کا انفس وآفاق میں کہیں وجود نہیں۔

*****

سروسامان حیات کی محبت

اور اجتماعی اخلاق پر اس کے مضر اثرات

دنیا کے ناپائیدار فوائد کے لئے بھائی بھائی پر ظلم وستم کرتا ہے بیٹا باپ کا گلا کاٹ دیتا ہے امانت میں خیانت کی جاتی ہے اور عہد وپیمان توڑ دیے جاتے ہیں متاع دنیا وہ چیز ہے جس نے انسانوں کو حدود انسانیت سے تجاوز پر اکسایا، چوری اور ڈاکہ زنی پر ابھارا اور انسانی معاشرہ کچھ ایسی شکل اختیار کر گیا جیسے درندوں کی بستی ہو۔ تجار دھوکا فریب کرتے ہیں امراء اور روؤسا سرکشی پر اتر آتے ہیں اور قضاۃ وحکام رشوتیں لیتے ہیں اور راہ حق وصواب سے انحراف کرتے ہیں اہل علم کتمان حق کرتے ہیں مفتیان کرام غلط فتاویٰ صادر فرماتے ہیں۔ اہل قلم کذب وافتراء کو اپنا شعار بنا لیتے ہیں۔ شعراء اشراف کی ہجو پر اتر آتے ہیں۔ ان سارے مذموم اعمال کا محرک کیا ہوتا ہے؟ صرف ایک چیز دنیا اور اس کے فوائد ومنافع اور یہ کام وہی لوگ کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ سے ملاقات کی امید نہیں رکھتے اور نہ یوم حساب پر ایمان رکھتے ہیں دوسرے لفظوں میں جو عقیدہ وایمان سے عاری ہوتے ہیں قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے اہل جنت اور اہل دوزخ کا ایک مکالمہ نقل فرمایا ہے۔ جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ غلط کار لوگوں کا اعمال خیر کی توفیق نہ ملنے اور اعمال شر ہی میں منہمک رہنے کی وجہ فقط ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کا فقدان ہے۔ اہل ایمان جنت میں داخل ہونے کے بعد، عذاب دوزخ میں مبتلا لوگوں سے سوال کریں گے۔

مَاسَلَکَکُمْ فِیْ سَقَر ۝ قَالُوْالَمْ نَکُ مِنَ الْمُصَلِّیْنَ ۝ وَلَمْ نَکُ نُطْعِمُ الْمِسْکِیْن ۝ وَکُنَّانَخُوْضُ مَعَ الْخَآئِضِیْن ۝ وَکُنَّا نُکَذِّبُ بِیَوْمِ الدِّیْن ۝

(مدثر. ۴۲.۴۶)

"تمہیں دوزخ میں کس چیز نے داخل کیا۔ وہ جواب دیں گے ہم نماز نہیں پڑھا کرتے تھے۔ اور ہم مساکین کو کھانا بھی نہیں کھلایا کرتے تھے۔ نیز ہم خدا اور سول کی تعلیمات پر نکتہ چینی کرنے والوں کے ساتھ مل کر نکتہ چینی کیا کرتے تھے اور ہم روز جزا کی تکذیب کیا کرتے تھے"۔

اسی طرح فرعون کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَاسْتَكْبَرَ هُوَ وَجُنُودُهُ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَظَنُّوا أَنَّهُمْ إِلَيْنَا لَا يُرْجَعُونَ.

''زمین میں خود فرعون بڑا بنا اور اس کے لشکروں نے بھی ناحق تکبر کیا اور ان کا گمان تھا کہ وہ مرنے کے بعد ہماری طرف نہیں پلٹیں گے''۔

مقصود یہ ہے کہ دنیوی ساز و سامان کے حصول کی طرف انسان بہت شدید میلان رکھتا ہے اور اسی کام میں بسا اوقات ساری عمر گنوا دیتا ہے اور خدا و یوم آخرت کسی کا بھی خوف اس کے دل کے قریب نہیں پھٹکتا اس دلدل سے انسان کو اگر کوئی قوت نکال سکتی ہے تو وہ عقیدہ و ایمان کی قوت ہے جہاں یہ قوت مفقود ہو گئی یا ضعف و اضمحلال کا شکار ہوئی تو وہیں سے انسان بے لگام ہو کر ایسی حرکات کا مرتکب ہونا شروع ہو جاتا ہے جو انفرادی و اجتماعی زندگی کا ستیاناس کر دیتی ہیں

فرعون کے فساد فی الارض کی وجہ کیا تھی؟ یہی کہ وہ یوم آخرت پر ایمان نہیں رکھتا تھا۔ اگر وہ اس حقیقت کو تسلیم کر چکا ہوتا کہ موت کے بعد مجھے ایک علیم و خبیر خدا کے روبرو اپنے ہر عمل کی جواب دہی کرنی ہے تو وہ کبھی ظلم و ستم نہ کرتا اور آتش دوزخ کے مہیب شعلوں میں جلنے والوں نے کس بات کا اعتراف کیا اور اعمال خیر سے تہی دامن کی کیا وجہ بیان کی؟ صرف یہی کہ ''کُنَّا نُکَذِّبُ بِیَوْمِ الدِّیْن'' ہم روز جزا کو جھٹلاتے تھے کیونکہ روز جزاء کی تصدیق کا عقیدہ ہی تو وہ قوت تھی جو انہیں ترغیب حسنات بھی دیتی اور ارتکاب سیئات سے باز بھی رکھ سکتی تھی۔

دوسری طرف دیکھیے سر و سامان دنیا کے بارے میں رسول اللہ کیا ارشاد فرما رہے ہیں۔

حضرت عمرؓ نے عرض کی یا رسول اللہ آپؐ کے پہلوئے مبارک پر چٹائی کے نشان پڑ گئے ہیں کیا اس سے زیادہ نرم و نفیس بچھونا نہ مہیا کر دیا جائے جواب رسالتمآب سنیئے اور ایمان کے ان گہرے اثرات کا اندازہ کیجئے جو حیات انسانی پر مرتب ہو کر رہتے ہیں۔ مجھے سر و سامان دنیا سے کیا واسطہ میری اور دنیا کی مثال تو ایسے ہے جیسے کوئی مسافر دن کی گرمی میں چلتا رہے اور کسی سایہ دار درخت کے نیچے پل بھر کیلئے ٹھہرے پھر اسے چھوڑ کر آگے چل دے اور یہ دیکھئے حضرت علیؓ کیا کہہ رہے ہیں۔ مخاطب دنیا ہے جو حسین و جمیل دوشیزہ کا روپ دھارے سامنے کھڑی ہے۔ اور'' نظر کو فریب دینے والی! جا کسی اور کو فریب دے! مجھ سے تعرض کرتی ہے؟ یا میری طرف میلان رکھتی ہے؟ میں تجھے تین طلاق دے چکا ہوں۔ اب رجوع کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا''۔ یہ کون بول رہا

ہے؟ ابن ابی طالب۔ نہیں جذبہ ایمان سے سرشار علی مرتضٰی بول رہے ہیں۔ ان کا ایمان بول رہا ہے جس کا نصب العین مال و متاع دنیا نہیں اس سے بہت بلند و برتر، بہت عظیم و جلیل اور بہت بیش قیمت انعامات خداوندی ہیں۔

مالاعین رأت ولااذن سمحت وماخطر لقلب بشر.

پس ایمان ہی وہ منفرد جوہر ہے جو مومن کے اندر ترغیبات دنیا کو ٹھکرانے کی تاب و تواں پیدا کرتا ہے۔ اس کے دل کو اس یقین سے معمور کر دیتا ہے کہ اللہ کے نزدیک روئے ارض کی ساری دولت بھی مچھر کے پر کے برابر قدر و قیمت نہیں رکھتی وہ اسے دنیا کا غلام نہیں بننے دیتا لیکن یہ بات واضح رہے کہ ایمان سر و سامان دنیا کے استعمال و استمتاع سے نہیں روکتا بلکہ وہ کہتا ہے اس کو مقصد اصلی نہ سمجھو غایت الغایات قرار نہ دو اور اس میں کچھ شک نہیں کہ ایمان و اخلاق کا مقابلہ کرنا تو درکنار، مادی سر و سامان اور دینوی لذائذ و منافع کے اندر اتنی سکت بھی نہیں کہ وہ اس کا سامنا ہی کر سکیں۔

طبیعت و جبلّت کی قوت اور ایمان کی قوت:۔

معاشرہ کو سعادت کے مرتبہ کمال تک پہنچانے کیلئے جن اصول و اخلاق کی ضرورت ہے ان میں سے ایک کا اثبات ہو چکا یعنی مال و متاع دنیا کی تحصیل کو اصلی اور حقیقی نصب العین نہ بنایا جائے اور اسے کبھی یہ حیثیت نہ دی جائے کہ دین و ایمان کے تقاضے مجروح ہونے لگیں اس کے بعد ہم گزارش کریں گے کہ دوسری چیز جسے افراد معاشرہ کو اپنے اندر پیدا کرنا چاہیے وہ جبلّی و فطری داعیات پر ضبط ہے ان داعیات میں سب سے طاقتور داعیہ جنس کا ہے جس کو عام حالات میں بھی قابو میں رکھنا بڑا دشوار ہے لیکن ایام شباب میں تو خاص طور پر یہ تمام حدود سے تجاوز کر جانا چاہتا ہے۔ اس عالم میں نہ اسے کسی قانون کا پاس ہوتا ہے نہ کسی فلسفی کے افکار و نظریات سے کوئی واسطہ یہ حدود و قیود نا آشنا داعیہ اگر کسی قوت کی مزاحمت کے آگے بے بس ہوتا ہے تو وہ ایمان کی قوت ہے حضرت یوسف علی نبینا وعلیہ السلام نوجوان ہی تو تھے اس پر مستزاد یہ کہ ایسے ماحول میں پہنچا دیے گئے جہاں داعیہ جنسی کی تسکین کے سارے سامان موجود تھے ایک منصب و جمال سے بہرہ ور خاتون خود دعوت گناہ دے رہی تھی وہ خاتون جو حاکم وقت کی اہلیہ تھی ذی اقتدار و ذی شان

اوران کی مالکہ اور یہ اس کے غلام مجبور، دونوں تنہا تھے۔ قانون کی نظر سے مستور اور لوگوں کی دسترس سے دور غور فرمایئے اس وقت کیا چیز سیدنا یوسف کی ممدومعاون بنی جس نے خود ان کے داعیہ جنسی کو بھی ضبط میں رکھا اور اس مشتعل خاتون کی بھی پوری قوت کے ساتھ مزاحمت کی یہ صرف ایمان تھا۔ خدا کے حاضر ناظر ہونے پر ایمان۔ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے اور اللہ کے محاسبہ ومواخذہ پر ایمان اور اس بات پر ایمان کہ اپنے داعیہ جنسی کی تسکین کی یہ صورت حرام ہے اور خدا کے غضب کو دعوت دینے والی اور اس کی رحمت سے دور کردینے والی ہے۔ یہ سیدنا یوسفؑ کا ذکر تھا جو خدا کے جلیل القدر پیغمبر تھے اور جن کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ انبیاء ورسل غیر معمولی اوصاف کے حامل ہوتے ہیں تو آیئے ایک عام عورت کا واقعہ سنیئے۔ حضرت عمرؓ کا عہد خلافت تھا آپ رات کو عامۃ المسلمین کے حالات معلوم کرنے کی غرض سے گشت کررہے تھے ایک مکان کے پاس سے گزرتے وقت آنجناب نے سنا ایک عورت پرسوز آواز میں گا رہی تھی اس کیلئے اپنے شوہر کی جدائی ناقابل برداشت ہو رہی تھی جو ممالک اسلامیہ کی سرحدوں پر جہاد وقتال میں مصروف تھا اور کئی مہینوں سے گھر نہیں آسکا تھا نوجوان دوشیزہ کے جذبات اشعار کی صورت میں ابل پڑے تھے۔

لَقَدْ طَالَ هٰذَا اللَّيْلُ وَاسْوَدَّ جَانِبُهٗ ... وَاَرَّقَنِيْ اَنْ لَّا حَبِيْبَ اُلَاعِبُهٗ
فَوَاللّٰهِ لَوْلَا اللّٰهُ تُخْشٰى عَوَاقِبُهٗ ... لَحُرِّكَ مِنْ هٰذَا السَّرِيْرِ جَوَانِبُهٗ

رات تاریک اور طویل ہوگئی ہے اور میری نیند غائب ہوچکی ہے کیونکہ کوئی محبوب نہیں جس کے ساتھ میں دل بہلاؤں خدا کی قسم اگر اللہ کا ڈر نہ ہوتا اور اس کے احکام کی نافرمانی کے نتائج وعواقب کا خوف نہ ہوتا تو اس پلنگ کے اطراف وجوانب کو ہلا ڈالا جاتا۔

داعیہ جنس کی طرح جبلی طور پر انسان میں ایک اور زوردار داعیہ غضب وانتقام کا بھی موجود ہوتا ہے جو بسا اوقات اتنی شدت اختیار کرجاتا ہے کہ مغلوب الغضب انسان پر وحشی اور درندے کا گمان ہونے لگتا ہے۔ داعیہ غضب جب زور پکڑتا ہے تو وہاں نہ کسی قانون کا بس چلتا ہے نہ کوئی فلسفہ اخلاق کام آتا، معمولی باتوں پر لوگ جھگڑ پڑتے ہیں۔ اور آپے سے باہر ہوجاتے ہیں نتیجۃً قتل وغارت گری کا بازار گرم ہوجاتا ہے معاشرتی زندگی میں تصادم کی بے شمار صورتیں جو آئے دن پیدا

ہوتی رہتی ہیں ان کے پیچھے کیا محرک کارفرما ہوتا ہے۔ یہی داعیہ غضب، اس شعلہ جوالہ کی حدت کو کم کرنے والی اور بالآخر اسے ٹھنڈا کرکے رکھ دینے والی چیز ایمان کے سوا اور کوئی نہیں۔ ایمان آدمی کو مجبور کرتا ہے کہ غصہ تھوک دے زیادتی کرنے والے کو معاف کردے جہالت کے برتاؤ پر صبر وحلم سے کام لے بلکہ برا سلوک کرنے والے کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آئے۔ حضرت آدمؑ کے دو بیٹوں نے قربانی کی، ایک کی قربانی قبول ہوگئی جبکہ دوسرے کی قربانی نامقبول ٹھہری۔ اس پر موخر الذکر بیٹا غصہ میں آگیا اور مشتعل ہوکر کہنے لگا ''لَاَقْتُلَنَّکَ'' میں تجھے قتل کرکے دم لوں گا۔ مگر صاحب ایمان بیٹا اشتعال کے جواب میں گرمی نہیں دکھاتا بلکہ ٹھنڈے دل ودماغ کے ساتھ کہتا ہے:۔

اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ لَئِنْۢ بَسَطْتَّ اِلَيَّ يَدَكَ لِتَقْتُلَنِيْ مَا اَنَا بِبَاسِطٍ يَّدِيَ اِلَيْكَ لِاَقْتُلَكَ اِنِّيْ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ۔

''اللہ تو اہل تقویٰ ہی کو نذریں قبول کرتا ہے اگر تو مجھے قتل کرنے کیلئے ہاتھ اٹھائے گا تو میں تجھے قتل کرنے کیلئے ہاتھ نہ اٹھاؤں گا میں اللہ رب العالمین سے ڈرتا ہوں''۔

معلوم ہوا کہ اللہ رب العالمین سے ڈرنے والے کبھی کسی کے درپے آزار نہیں ہوتے نہ غیظ وغضب کے عالم میں حد سے تجاوز کرتے ہیں کسی کے خلاف ظلم وزیادتی کرنے سے انہیں خوف خدا روکے رکھتا ہے چاہے جبلی داعیات کا اقتضا کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ حضرت عمرؓ کا قول ہے خدا سے ڈرنے والے لوگ اپنے غیظ وغضب کی تسکین کا سامان نہیں کرتے جو جی میں آتا ہے اسے کر گزرنے سے انہیں خوف خدا مانع ہوتا ہے اور اگر یوم قیامت نہ ہوتا تو معاملہ اس کے برعکس ہوتا جو تم دیکھ رہے ہو۔ حضرت عمر بن العزیزؒ سے ایک آدمی ہمکلام ہوا اور آنجناب سے نہایت بری طرح پیش آیا حتیٰ کہ آپ غضبناک ہوگئے۔ آپ اس وقت امیر المومنین تھے۔ آپ نے ارادہ کیا کہ اسے درست کردیا جائے لیکن بعد ازاں رک گئے اور اس آدمی کو مخاطب کرکے فرمانے لگے تمہاری کوشش تو تھی کہ میرے اندر کا شیطان نشہ اقتدار کے زیر اثر مجھے بھڑکاتا اور میں تمہاری خوب خبر لیتا جس کی پاداش میں کل قیامت کے دن تم میرا دامن پکڑ لیتے لیکن اب جاؤ اللہ تمہیں معاف کرے میں تمہارے ساتھ مزید گفتگو نہیں کرنا چاہتا''۔

پس ثابت ہوا کہ ایک سعادت مند معاشرہ کے افراد کو اخلاق کے اس بلند مقام پر فائز ہونا چاہیے جہاں جبلی واعیات ایمان کی بالادستی کو قبول کر لیتے ہیں اور خود کو مکمل طور پر اس کی تحویل میں دے کر فخر محسوس کرتے ہیں۔

ایمان، انانیت کو فطری حدود سے آگے بڑھنے نہیں دیتا۔

انانیت یا اپنی ذات سے محبت ایک فطری امر ہے اور کوئی فرد بھی اس سے خالی نہیں اپنی انا کی برتری اور اپنی ذات کے وقار کا سوال عام طور پر انسان کے نزدیک زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ اور اہم سوال بن جاتا ہے اپنا بول بالا رکھنے کیلئے اپنا مفاد حاصل کرنے کیلئے اور اپنی عزت واقتدار کا بھرم قائم کرنے کیلئے جذبہ انانیت خاص طور پر ابھرتا ہے اور معاشرتی زندگی میں خصوصیت ونزاع کے سینکڑوں بیج بو جاتا ہے اس جذبہ فاسد نے کتنے خاندانوں کی عزت خاک میں ملادی، کتنے قبیلوں کو آپس میں لڑوادیا اور کتنی قوموں کو برسوں متحارب رکھا۔ انسانی تاریخ میں یہ پورا ریکارڈ دیکھا جاسکتا ہے۔

اس جنون میں جب کوئی فرد یا معاشرہ مبتلا ہو جاتا ہے تو پھر کم ہی کوئی چیز اس پر اثر انداز ہوتی ہے ہوا کے گھوڑے پر جب انانیت زدہ لوگ سوار ہوتے ہیں اور پندار نفس اسے برابر مہمیز لگاتا ہے تو اس وقت کوئی ضابطہ، کوئی قانون اور ہوش وخرد کی کوئی مقدار بھی اسے زنجیر پا نہیں کر سکتی ایمان کی لگام البتہ ایک ایسی چیز ہے جو اس کی سرکشی کو دور کر سکتی ہے ایمان سب سے پہلے انسان کو اس کی حقیقت سمجھاتا ہے تاکہ اپنے بارے مین وہ کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہونے پائے اس طرح وہ اس جڑ ہی کو کاٹ دیتا ہے جہاں سے شاخ انانیت غذا حاصل کر رہی ہوتی ہے۔ دین وایمان کی رو سے انسان اللہ کی مخلوق ہے۔ اللہ کے سہارے زندہ ہے اس کی تمام صلاحیتیں اور استعدادیں اللہ کی عطا کردہ ہیں کوئی ایک چیز بھی اس کی اپنی نہیں نہ اس کا رزق اس کے بس میں ہے نہ زندگی نہ موت نہ عزت اور ذلت کا یہ مالک ہے نہ حکومت واقتدار اس کی ذاتی شے ہے توفیق الٰہی کے بغیر یہ دنیا میں کوئی کام نہیں کر سکتا۔ کوئی کام تو درکنار اس کیلئے ایک تنکے کو بھی زمین سے اٹھانا اللہ کی مدد کے بغیر ممکن نہیں۔ ایک سانس بطور خود لے لینا ایک بات تک کر سکنا اس کے قبضہ قدرت میں نہیں۔ جب انسان کی اوقات یہ ہے اور اس اوقات کا شعور بھی وہ رکھتا ہو تو انانیت کا غلط جذبہ اس

کے دل میں کہاں پیدا ہو سکتا ہے؟ اور اگر کسی نہ کسی طرح پیدا ہو جائے تو خدا پر ایمان، حشر ونشر اور جنت ودوزخ پر ایمان اسے معطل اور مفلوج کر کے رکھ دیتا ہے۔

ام المومنین حضرت ام سلمہؓ بیان کرتی ہیں کہ رسولؐ کے پاس دو آدمی اپنے جھگڑے کا فیصلہ کرانے کیلئے آئے۔ وہ میراث کے بارے میں جھگڑ رہے تھے ہر ایک کی زبان پر تھا ھذا حقی (یہ حق ہے) مگر ثبوت کسی کے پاس نہ تھا تاہم دوسرے کے حق کا انکار بڑی شدومد سے کر رہے تھے رسول پاکؐ نے اندازہ کر لیا کہ بات کچھ بھی نہیں ان میں سے ہر ایک کے اندر انانیت بول رہی ہے۔ آپؐ نے ان کے دل ودماغ کو جھنجھوڑتے ہوئے فرمایا میں ایک انسان ہوں اور تم اپنے جھگڑے کا فیصلہ کرانے کیلئے میرے پاس آئے ہو، ہو سکتا ہے کہ تم میں سے کوئی دوسرے کے مقابلے میں زیادہ چرب زبان ہو اور اپنے موقف کو بہتر طریقے سے بیان کر دے تو میں اس کی بات کو سن کر اس کے حق میں فیصلہ کر دوں لیکن یاد رہے کہ جس کو میں نے اس کے بھائی کے حق میں سے کچھ حصہ دے دیا وہ آگ کا ٹکڑا ہو گا اسے چاہیے کہ دوسرے کے حق کو قبول نہ کرے۔ جھگڑنے والوں نے جب یہ کلمات تنبیہ سنے تو ان کے اندر کا جذبہ خشیّتِ حیثیت الٰہی بیدار ہو گیا اور فکر آخرت دامنگیر ہو گئی۔ دونوں رو پڑے اور ہر ایک دوسرے کو کہنے لگا۔ میرا حق بھی آپ لے لیں میں اپنے حق سے دستبردار ہوتا ہوں اس پر نبی اکرمؐ نے فرمایا۔ اب جب تم اس طرح سے سوچنے لگے ہو تو مناسب یہ ہے کہ اس ورثہ کو آپس میں تقسیم کر لو اور اپنا اپنا حق لے لو اور تقسیم کرتے وقت اگر کسی کے حق میں سے کچھ دوسرے کے حصے میں جانے کا احتمال ہو تو درگزر سے کام لو اور ہر ایک دوسرے پر اسے مباح قرار دیدے۔

غور فرمائیے کہ یہ نزاع جو سراسر انانیت کی پیداوار تھی۔ کس چیز کی بدولت ختم ہوئی۔ ایمان اور صرف ایمان کی بدولت۔ ایمان انا کے بت کو پاش پاش کرنے کیساتھ آدمی کے اندر عفاف اور زہد وایثار کے اوصاف بھی پیدا کرتا ہے وہ دوسرے کے حق سے دستبردار تو ہوتا ہی ہے اپنے حق کو بھی دوسرے کی جھولی میں بخوشی ڈال دینا چاہتا ہے۔ رسول پاکؐ نے دو ایمانداروں کا قصہ بیان فرمایا۔ ایک نے دوسرے سے زمین خریدی خریدار کو بعد میں زمین سے ایک مٹکا ملا جس میں سونا تھا۔ اس نے زمین فروخت کرنے والے کے سامنے سونے سے بھرا ہوا مٹکا رکھتے ہوئے کہا۔ اپنا

سونا لے لیجئے میں نے آپ سے زمین خریدی تھی یہ سونا نہیں۔ دوسرا آدمی جو دولت ایمان سے مالا مال تھا گویا ہوا میں نے زمین اور جو کچھ اس میں ہے سب آپ کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا۔ رسول پاکؐ نے فرمایا بعد ازاں وہ دونوں ایک تیسرے آدمی کے پاس بغرض فیصلہ گئے اس نے ان سے پوچھا تم صاحب اولاد ہو؟ ایک نے جواب دیا میرا ایک لڑکا ہے دوسرا بولا میری ایک لڑکی ہے فیصلہ کرنے والے نے کہا دونوں کا آپس میں نکاح کر دو اور اس سونے کو مصرف میں لاؤ۔ پھر جو بچ رہے اسے صدقہ کر دینا۔ اس طرح دنیا کے سامنے یہ عجیب منظر آیا کہ سونے کا ڈھیر سامنے تھا مگر دونوں میں سے کوئی بھی اس کا طلبگار نہ تھا۔ ہر ایک اس سے بچنا چاہتا تھا اور ساتھی سے کہہ رہا تھا یہ تیرا ہے حالانکہ ایسے مواقع پر لوگ کہا کرتے ہیں۔ یہ میرا ہے صرف میرا۔

انانیت کا اس درجہ استیصال اور زہد و ایثار کا یہ کمال کسی معاشرہ میں اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب وہ اس اخلاق سے متخلق ہو جسے ایمان جنم دیتا ہے۔

*****

انسان پہ عادات و میلانات کا تسلط

انسان بسا اوقات اپنی عادات کا بھی غلام بن کر رہ جاتا ہے بلکہ بعض محققین کا کہنا ہے کہ انسان پیدا بھی غلام ہوتا ہے۔ اور مرتا بھی غلام ہے۔ پیدائش کے وقت اسے قمیص پہنائی جاتی ہے تو وفات کے وقت کفن۔ یعنی مہد سے لے کر لحد تک وہ عادات و روایات کا اسیر ہوتا ہے۔ بعض فلاسفہ نے عادت کو طبیعت ثانیہ قرار دیا ہے کیونکہ انسان پر اس کی گرفت بھی قریب قریب اسی نوعیت کی ہوتی ہے جتنی طبیعت اولی یعنی فطرت انسانی کی، اور جس سے انسان انحراف نہیں کرتا، آنکھ دیکھتی ہے کان سنتے ہیں، معدہ خوراک ہضم کرتا ہے۔ ہاتھ حرکت و عمل کرتے ہیں اور ٹانگیں چلنے کا کام دیتی ہیں یہ سب کچھ اعضائے جسمانی کی عین فطرت ہے۔ اسی طرح انسان کا عمل پیدائش اور آباؤ اجداد کے اخلاق و اطوار کا ورثہ میں منتقل ہونا بھی اقتضائے فطرت ہے۔ سالہا سال سے جن میلانات و رجحانات اور جن عادات کا کسی خاندان یا معاشرہ میں چلن رہے ان سے گلوخلاصی کرا لینا آسان نہیں ہوتا۔ ان میں سے بہت سی چیزوں کی قباحت بھی انسان پر واضح ہوتی ہے مگر اس کے باوجود وہ اس کی زندگی کا جزولاینفک بنی رہتی ہیں۔

شراب نوشی کس کے نزدیک پسندیدہ فعل ہے؟ ظاہر ہے کہ کسی کے نزدیک بھی نہیں لیکن پھر یہ کیا بات ہے کہ ''چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی'' جواری جوا کھیلتا ہے اور چور چوری کرتا ہے اور مسلسل کئے چلا جاتا ہے۔ اسے سزا بھی ملتی ہے مگر بار بار سزا بھگتنے کے باوجود وہ باز نہیں آتا، زانی زنا کرتا ہے۔ وہ اس فعل حرام کو حرام اور انتہائی قبیح سمجھتا ہے اور اپنی اولاد کو اس کے قریب بھی نہیں جانے دینا چاہتا۔ مگر خود اسے جولت پڑ چکی ہے وہ چھوٹنے کا نام نہیں لیتی کیوں؟ صرف اس لئے کہ وہ عادی مجرم ہے اور عادت بڑا گہرا تسلط اس پر جمائے ہوئے ہے۔

یہ تو افراد کی بات تھی معاشرے کا معاملہ بھی اس سے مختلف نہیں۔ امریکہ کتنا تعلیم یافتہ ہے اس ملک کے عوام اور ارباب حکومت جنہوں نے شراب کے تباہ کن اثرات کو محسوس کرنے کے بعد اس کا سدباب کرنا چاہا۔ تو 1919ء میں عوام کے منتخب نمائندوں نے ایک قانون پاس کیا جس کی رو سے امریکہ میں شراب حرام کر دی گئی اس قانون پر سختی کے ساتھ عمل درآمد کرانے کیلئے پوری

حکومت کی مشینری حرکت میں آ گئی۔ بحری بیڑے میں فوج تعینات کی گئی تا کہ شرابی حدود مملکت سے باہر جا کر شغل شراب نہ کر سکیں۔ فضائیہ کے سپرد فضائی نگرانی کا کام کیا گیا۔ ریڈیو، اخبارات، رسالے اور کتابیں اور دیگر اشاعتی مواد کے ذریعے شراب کی مذمت کی جانے لگی۔ شراب سے نفرت دلانے کیلئے تقریریں کی جاتی رہیں تصویریں چھاپی گئیں اور سینماؤں میں اس موضوع سے متعلق فلمیں دکھائی جانے لگیں اور متواتر چودہ برس تک یہ مہم چلتی رہی اور حکومت امریکہ نے اس مقصد کیلئے کروڑوں ڈالر صرف کر ڈالے لاکھوں افراد کو جیلوں میں ٹھونس دیا۔ ہزاروں لوگوں کو جرمانے کئے گئے اور کوئی تین سو کے لگ بھگ افراد جان سے ہاتھ دھو بیٹھے مگر ان ساری تدابیر کے باوجود امریکی معاشرے کی شراب سے وابستگی کم نہ ہوئی بلکہ اس میں کچھ اضافہ ہی ہوا اور لوگ سو طرح کے جتّلے بہانے کر کے قانون کا منہ بھی چڑاتے اور شوق شراب بھی پورا کرتے۔ بالآخر حکومت نے مجبور ہو کر 1933ء میں تحریم شراب کے قانون کو منسوخ کر ڈالا یہ کس کی فتح تھی؟ عادت کی امریکی معاشرے کی۔ اس عادت کے آگے قانون کو گھٹنے ٹیکنے پڑے۔ آیئے ذرا سوچیں کہ اجتماعی عادات ور جحانات کا تسلط معاشرے سے ختم کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ اور اگر یہ ممکن ہے تو کس طرح؟

ایمان کو ہر چیز پر بالا دستی حاصل ہے:۔

ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ معاشرہ کو حقیقی سعادت سے ہم کنار کرنے کیلئے ان اصول اخلاق پہ عمل پیرا ہونا ناگزیر ہے جو دین وایمان سے اخذ کئے گئے ہوں اور تمام معاشرتی برائیوں کا انسداد بھی کما حقہ تب ہی ممکن ہے جب ایمان کی طرف رجوع کیا جائے جبلی ونفسانی داعیات ہوں یا جذبہ انانیت یا عادات ومیلانات ہر ایک کو قابو میں رکھنا اور حدود سے متجاوز نہ ہونے دینا ایمان کا کام ہے اور کسی کا نہیں۔ ایمان ہی عزم صمیم کا خالق ہے۔ وہ قوت ضابطہ ہے جو نفسانی داعیات کو ان کے فطری حدود سے آگے نہیں بڑھنے دیتی اور وہ عزم محکم ہے جو عادات کو بدل کے رکھ دیتا ہے۔

اس شراب کی لت میں آج سے ڈیڑھ ہزار سال پہلے عرب کا معاشرہ بھی بہت بری طرح مبتلا ہو چکا تھا ذرا ملاحظہ کیجئے کہ کس طرح ایمان نے قلیل عرصہ میں عربوں کو اس برائی سے یکسر

نجات دلا دی۔ ابتداءً قرآن میں حکم نازل ہوا کہ اے نبیؐ انہیں کہہ دو کہ ان دونوں چیزوں (شراب اور جوا) میں بڑی خرابی ہے۔ اگر چہ ان میں لوگوں کیلئے کچھ منافع بھی ہیں مگر ان کا گناہ ان کے فائدے سے بہت زیادہ ہے۔ پھر کچھ عرصہ بعد یہ حکم نازل ہوا کہ نشہ شراب کی حالت میں نماز کے قریب نہ جاؤ۔ یہ گویا ذہنوں کو تدریجاً تیار کیا جا رہا تھا کہ شراب بہر حال بری چیز ہے اسے چھوڑ ہی دینا چاہیے۔ اور بالآخر ارشاد ہوتا ہے اے ایمان لانے والو یہ شراب اور جوا اور یہ آستانے اور پانسے یہ سب گندے شیطانی کام ہیں ان سے پرہیز کرو امید ہے کہ تمہیں فلاح نصیب ہوگی شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعے تمہارے درمیان عداوت اور بغض ڈال دے اور تمہیں خدا کی یاد سے اور نماز سے روک دے۔ پھر کیا تم ان چیزوں سے باز رہو گے؟ (المائدہ: ۹۰۔۹۱)

اس حکم کا نازل ہونا تھا کہ اطاعت وامتثال امر کے عجیب وغریب مظاہرے ہوئے دنیا نے دیکھا کہ شراب کے مٹکے توڑ دیئے گئے۔ جام وساغر اٹھا کر پھینک دیئے گئے اور شراب خانہ خراب یوں گلیوں میں بہنے لگی جیسے پانی بہتا ہو۔ حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں کہ میں ابوعبیدہؓ ابی بنؓ کعب اور دیگر حضرات کو شراب پلا رہا تھا کہ ایک آنے والا آیا اور اس نے خبر دی کہ شراب حرام کر دی گئی چنانچہ ابوطلحہؓ نے کہا اے انسؓ اٹھو اور شراب کو باہر گلی میں بہادو۔ یہ کون حکم دے رہے ہیں وہ کہ جن کی گھٹی میں شراب پڑی تھی۔ وہ جو ہر چیز کی جدائی برداشت کر سکتے تھے مگر شراب کی مفارقت نہیں۔ اس معاشرے کے لوگ کہ جس معاشرے کے ایک شاعر نے شراب کے ساتھ تعلق کچھ اس طرح بیان کیا ہے کہ جب میں مر جاؤں تو مجھے انگور کی بیل کے نیچے دفن کرنا تا کہ اس کی جڑوں سے موت کے بعد بھی میرے رگ وریشے سیراب ہوتے رہیں۔ امرؤالقیس (ممتاز جاہلی شاعر) کو جب اپنے باپ کے قتل کی خبر ملی تو اس وقت وہ میخواروں کی مجلس میں بیٹھا ناؤ نوش میں مصروف تھا یہ المناک خبر سن کر کہنے لگا۔ ''اَلْیَوْمَ خمرٌ وَ غداً امرٌ'' آج تو شغل شراب جاری رہے گا۔ کل سوچیں گے کیا کرنا ہے۔

ہم بیان کر رہے تھے کہ شراب کے یہ متوالے جب دولت ایمان سے مالا مال ہوئے تو پھر شراب محبوب نہ رہی بلکہ خدا اور رسولؐ کی محبت ہر چیز پر غالب آ گئی۔ ان کے ایک اشارے پر

شراب کے ساتھ اپنا صدیوں کا تعلق منقطع کر دیا۔ حضرت ابو موسیٰؓ الاشعری روایت کرتے ہیں کہ ہم بیٹھے شراب پی رہے تھے کہ میں اٹھا اور رسول پاکؐ کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ اس وقت تحریم خمر کا حکم نازل ہوا ہی تھا اور آپؐ صحابہ کرامؓ کو وہ آیت سنا رہے تھے۔ میں نے بھی آکر اپنے ساتھیوں سے حرمت شراب کا ذکر کیا جو ابھی تک شراب نوشی میں مصروف تھے تو ان میں سے کوئی پیالہ پکڑ رہا تھا۔ کسی نے ساغر ہونٹوں کو لگایا ہی تھا اور کوئی دو چار گھونٹ پی چکا تھا اور میں جب آیت پڑھتے پڑھتے اس مقام پر پہنچا 'فَهَلْ اَنْتُمْ مُنْتَهُوْنَ' تو سب بیک زبان پکار اٹھے ''اِنْتَهَيْنَا ...... اِنْتَهَيْنَا رَبَّنَا '' اے ہمارے رب ہم باز آ گئے اے ہمارے رب ہم باز آ گئے۔ اور یوں آن واحد میں سالہا سال کی ایک عادت چھوٹ گئی۔ وہ عادت جو ان کی فطرت ثانیہ بن چکی تھی اور جس نے اس پورے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔

پس ثابت ہوا کہ کوئی عادت خواہ وہ کتنی ہی پختہ ہو۔ رگ و ریشہ مین رچ بس گئی ہو ایک فرد پر مسلط ہو یا پورے معاشرہ کو اپنا شکار بنا چکی ہو۔ ایمان کے ایک حملہ کی بھی تاب نہیں لا سکتی۔

*****

ایمان بحیثیت اساس اخلاق

نفس انسانی کی گہرائیوں میں ایک مخفی قوت موجود ہوتی ہے جسے نہ خوردبین سے دیکھا جا سکتا ہے نہ علم الطبیعات اس کا ادراک کر سکتا ہے۔ اس کا کام فرائض و واجبات کی طرف انسان کی راہنمائی کرنا ہے اور خیر و صلاح کی طرف اسے اس طرح کھینچ لینا جیسے مقناطیس قطب نما کی سوئی کو کھینچے رکھتا ہے اور شر و فساد سے اسے بچانا۔ جیسے باپ بیٹے کو غلط حرکات سے بچاتا ہے یا جیسے استاد اپنے تلامذہ پر نظر رکھتا ہے یہ باطنی قوت جو تاریکی میں روشنی کا کام دیتی ہے فضائل پر آمادہ کرتی اور رذائل سے باز رکھتی ہے۔ معروف کا حکم دیتی اور منکر سے منع کرتی ہے۔ علمائے اخلاق اسے ضمیر اور وجدان سے تعبیر کرتے ہیں اور اسلام نے اسی کا نام ''القلب'' (دل) رکھا ہے۔ رسولؐ سے ایک شخص نے نیکی اور گناہ کے بارے میں دریافت کیا تو آپؐ نے فرمایا ہر وہ کام نیکی ہے جسے کر کے باطن سکون محسوس کرے اور دل مطمئن ہو۔ اور گناہ وہ کام ہے جس کے ارتکاب سے نہ نفس کو سکون حاصل ہو اور نہ دل کو اطمینان اگرچہ مفتی حضرات تجھ کو اس کے جواز کے فتوے ڈالیں اور ایک دوسری حدیث میں ہے۔ آپؐ نے فرمایا اگرچہ لوگ تجھے فتویٰ دیں تاہم تو اپنے دل سے فتویٰ طلب کر۔

قلب و ضمیر اخلاق کا بنیادی ستون ہے۔ اس کے بغیر اخلاق کی عظیم الشان عمارت قائم نہیں رہ سکتی۔ زندہ ضمیر اخلاق کی تعمیر و تشکیل کا باعث بھی ہوتا ہے اور ایک مستعد دربان کی طرح اس کی حفاظت بھی کرتا ہے کوئی معاشرہ محض قوانین اور آئینی ضوابط کے بل بوتے پر یا پولیس اور فوج کی قوت سے ترقی و تنظیم اور سعادت و خوش بختی سے ہمکنار نہیں ہو سکتا۔ حصول سعادت کیلئے بیدار ضمیر اور زندہ قلوب کا وجود ضروری ہے اور یہ کلمۂ حکمت تو آپ سنا ہی ہو گا کہ عدل و انصاف قانون کے الفاظ میں نہیں بلکہ قاضی اور حاکم کے ضمیر میں ہوتا ہے ٹھیک اسی طرح عامتہ الناس کی نظر میں قانون کی کوئی وقعت نہیں ہوتی۔ ایک شاعر نے ان کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا:

لَن یصلح القانون فینار ادعاً حتی نکون ذوی ضمائر تردع

(ترجمہ) قانون کی سرزنش ہمارے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتی جب تک کہ ہم خوف سے لبریز دلوں کے حامل نہ بن جائیں۔

پس جب اخلاق کے نشو وارتقا میں ضمیر اس درجہ دخیل ہے تو آیئے اس امر کا جائزہ لیں کہ خود ضمیر کی تخلیق کا راز کس چیز میں مضمر ہے۔

ضمیر اور ایمان:۔

ضمیر کی تعمیر و تخلیق میں ایمان بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔ اسے زندگی عطا کرنے اس کی آواز کو زیادہ موثر بنانے اور ہر قدم پہ اس کی محرک اور فعال حیثیت برقرار رکھنے کیلئے ایمان ناگزیر ہے۔ اللہ پر ایمان انسان کے اندر یہ اعتقاد راسخ کر دیتا ہے کہ وہ جہاں بھی ہو اللہ اس کے ساتھ ہوتا ہے سفر میں، خلوت میں، جلوت میں اللہ سے اس کی کوئی کیفیت چھپی نہیں رہ سکتی۔ وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے انسان کے نہاں خانہ دل و دماغ کے اسرار و رموز، اس کے پوشیدہ اعمال اور اس کی ظاہری حرکات ہر ایک سے اللہ پوری طرح باخبر ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ط مَا يَكُوْنُ مِنْ نَّجْوٰى ثَلٰثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ وَلَا خَمْسَةٍ اِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ وَلَآ اَدْنٰى مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْثَرَ اِلَّا هُوَ مَعَهُمْ اَيْنَ مَا كَانُوْا ج ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ط اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ. (المجادلہ۔۷)

"کیا تم کو خبر نہیں ہے کہ زمین اور آسمانوں کی ہر چیز کا اللہ کو علم ہے؟ کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ تین آدمیوں میں کوئی سرگوشی ہو اور ان کے درمیان چوتھا اللہ نہ ہو یا پانچ آدمیوں میں کوئی سرگوشی ہو اور ان کے درمیان چھٹا اللہ نہ ہو، خفیہ بات کرنے والے خواہ اس سے کم ہوں یا زیادہ جہاں کہیں بھی وہ ہوں اللہ ان کے ساتھ ہوتا ہے پھر قیامت کے روز وہ ان کو بتا دیگا کہ انہوں نے کیا کچھ کیا ہے۔ اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے"۔

وَمَا تَكُوْنُ فِيْ شَاْنٍ وَّمَا تَتْلُوْا مِنْهُ مِنْ قُرْاٰنٍ وَّلَا تَعْمَلُوْنَ مِنْ عَمَلٍ اِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُوْدًا اِذْ تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ ط وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ وَلَآ اَصْغَرَ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْبَرَ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ.

"اے نبیؐ تم جس حال میں بھی ہوتے ہو اور قرآن میں سے جو کچھ سناتے ہو اور لوگو! تم بھی جو کچھ کرتے ہو اس سب کے دوران ہم تم کو دیکھتے رہتے ہیں کوئی ذرہ برابر چیز آسمان میں اس زمین میں ایسی نہیں

ہے نہ چھوٹی نہ بڑی جو تیرے رب کی نظر سے پوشیدہ ہو اور ایک صاف دفتر میں درج نہ ہو"۔

ایمان باللہ کے بعد ضمیر انسان کو جو چیز مزید سنوار اور نکھار دیتی ہے وہ یوم آخرت پر ایمان ہے۔ یوم آخرت پر ایمان دراصل اس حقیقت کا شعور ہے کہ مرنے کے بعد رب العزت کی بارگاہ میں انسان کو اپنے اعمال کا حساب دینا ہے ہر اچھے عمل کی جزا وصول کرنی ہے اور ہر برائی کا خمیازہ بھگتنا ہے اس وقت اس کی زندگی کی لحہ بہ لحہ تفصیل اس کے سامنے رکھ دی جائیگی۔

اِذْ يَتَلَقَّى الْمُتَلَقِّيٰنِ عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيْدٌ. مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ. (ق:۱۸)

"دو کاتب اس کے دائیں اور بائیں بیٹھے ہر چیز ثبت کر رہے ہیں کوئی لفظ اس کی زبان سے نہیں نکلتا جسے محفوظ کرنے کیلئے ایک حاضر باش نگران موجود نہ ہو"۔

اَمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّا لَا نَسْمَعُ سِرَّهُمْ وَنَجْوٰهُمْ ط بَلٰى وَرُسُلُنَا لَدَيْهِمْ يَكْتُبُوْنَ.

"کیا وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم ان کی پوشیدہ باتیں اور سرگوشیاں نہیں سنتے ہیں۔ ہم سب کچھ سنتے ہیں اور ہمارے فرشتے ان کے پاس ہی ہر چیز لکھتے ہیں"۔

حیات انسانی کا یہ سارا ریکارڈ...... جسے اللہ کے فرشتوں نے پوری جزئیات اور تفصیلات کے ساتھ مرتب کیا ہوگا اور جس کے مطابق اس سے مواخذہ و محاسبہ کیا جائیگا...... ایک ایسی ناقابل تردید دستاویز ہوگی کہ جس کا ذرا سا احساس ہی قلب کی زندگی کا ضامن اور ضمیر کی بیداری کا باعث ہے۔

اللہ کے بارے میں یہ اعتقاد اور یوم آخرت پر اس نوعیت کا ایمان ہی انسان کو ہر آن اللہ کی نگرانی کا احساس دلاتا ہے اور اپنے نفس کے محاسبہ پر مجبور کرتا ہے چنانچہ وہ کھلی آنکھوں سے اپنے افعال و اعمال کا جائزہ لیتا ہے۔ نتائج و عواقب پر نظر رکھتا ہے نہ ظلم و ستم کرتا ہے نہ خیانت و بدعہدی کا مرتکب ہوتا ہے نہ ڈینگیں مارتا ہے اور نہ تکبر کرتا ہے اور نہ اپنے فرائض کا انکار کرتا ہے اور نہ دوسروں کے حقوق کا دعویدار ہوتا ہے وہ کوئی ایسا کام نہیں کرتا جس کے محاسبے سے کلی خائف ہو نہ چھپ کر کوئی ایسی حرکت کرتا ہے کہ جس کے منصۂ شہود پر آجانے سے اسے ندامت لاحق ہو سکتی ہو خدا کے حاضر و ناظر ہونے کا یقین کامل اسے راہ صواب سے ذرہ برابر ادھر ادھر نہیں ہونے دیتا کما

قال شاعر صوفی:

إِذَا مَا خَلَوْتَ الدَّهْرَ يَوْمًا فَلَا تَقُلْ   خَلَوْتُ وَلٰكِنْ قُلْ عَلَيَّ رَقِيبُ!

وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ يَغْفُلُ سَاعَةً   وَلَا إِنَّ مَا تُخْفِيهِ عَنْهُ يَغِيبُ'

(ترجمہ) اگر تو ایک دن کیلئے بھی خلوت نشین ہو تو یہ نہ کہہ کہ میں اب تنہا ہوں بلکہ یہ کہہ کہ مجھ پر ایک علیم وخبیر نگران ہے اور اللہ کے بارے میں کبھی یہ گمان نہ کر کہ وہ ایک لحظ کیلئے بھی غافل ہو جاتا ہے یا جو کچھ تو اس سے چھپانا چاہتا ہے وہ اس کی نظر سے فی الواقع چھپ جاتا ہے۔

صوفیاء احتساب نفس:۔

ایک اہل اللہ سے سوال کیا گیا کہ اس ارشاد الٰہی کا کیا مطلب ہے۔

رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهٗ'.

اللہ ان سے راضی ہو گیا اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے اور یہ مقام اس شخص کو حاصل ہوتا ہے جو اپنے رب سے ڈر جائے۔

انہوں نے فرمایا کہ رب سے ڈر جانے کا مطلب ہے اپنے آپ کو رب کی نگرانی میں محسوس کرنا اپنے نفس کا محاسبہ کرنا اور آخرت کیلئے توشہ حسنات جمع کرنا۔

محمد بن علی الترمذیؒ نے فرمایا: اپنے آپ کو اس ذات کی نگرانی میں دے دے کہ جس کی نظر سے تو کبھی چھپ نہیں سکتا۔ اپنے شکر وسپاس کو اس کیلئے خاص کر دے کہ جس کے انعامات کا سلسلہ کبھی منقطع نہیں ہوتا۔ صرف اس کی فرمانبرداری اختیار کر کہ جس سے تو کبھی بے نیاز نہیں ہو سکتا اور اپنے خشوع وخضوع کا مستحق اس کو گردان کہ جس کی سلطنت سے قدم باہر رکھنا ممکن نہیں۔

حضرت ذوالنون مصریؒ سے پوچھا گیا: بندہ جنت کیسے حاصل کر سکتا ہے آپ نے فرمایا پانچ چیزوں سے: استقامت سے جو ہر شائبہ مکر وانحراف سے پاک ہو۔ کوشش سے جس میں سہو ونسیان نہ ہو خوف خدا سے جو بظاہر بھی ہو اور بباطن بھی۔ موت کی تیاری کرنے کے بعد اس کے انتظار سے اور محاسبہ نفس سے پیشتر اس کے کہ اس کا حساب لیا جائے۔

بلاشبہ وہ ضمیر جس کی تربیت ایمان کرتا ہے..... خوف خدا اور حساب آخرت سے سرشار ایمان بیدار وتوانا اور شدید الحس ہو جاتا ہے۔ وہ عمل سے پیشتر ہی انسان کا احتساب کرتا ہے کیا

کرنا چاہتا ہے؟ کیوں کرنا چاہتا ہے؟ کس کیلئے کرنا چاہتا ہے؟ پھر اسی پر اکتفا نہیں وہ عمل کے بعد بھی محاسبہ جاری رکھتا ہے تو نے کیا کیا ہے؟ کیوں کیا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ نور ایمان سے منور ضمیر بڑا ہی مستعد قاضی ہوتا ہے جو جزا یا سزا پر مشتمل اپنا فیصلہ فوراً صادر کر دیتا ہے اور اس کا فیصلہ باطنی طعن وملامت ہی کی صورت نہیں اختیار کرتا بلکہ کبھی کبھی مادی وجسمانی سزاؤں کا باعث بھی بن جاتا ہے۔

حضرت حسن بصریؒ نے "وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ" کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا کہ مومن جب بھی اپنے گریبان میں منہ ڈالتا ہے نفس کو معتوب کرنے لگتا ہے میری اس بات سے تیری کیا مراد تھی؟ میرے کھانے میں تیرا کیا ارادہ مضمر تھا؟ میرا پینا کس مقصد کے تحت تھا؟ مگر فاسق وفاجر کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہوتا ہے۔ وہ معصیت میں آگے ہی بڑھتا جاتا ہے اور کبھی پلٹ کر نفس پر عتاب بھیجنے کی اسے توفیق نہیں ہوتی۔

حضرت مالکؒ بن دینار نے فرمایا: اللہ اس بندے پر رحم فرمائے جس نے اپنے نفس کو سرزنش کرتے ہوئے کہا..... کیا تو اس چیز کا مالک نہیں؟ کیا تیرے پاس وہ چیز نہیں؟ اللہ کی نعمتیں یاد دلانے کے بعد پھر نفس کو لگام دی اور نکیل ڈال دی اور کتاب اللہ کی پیروی پر اسے مجبور کر دیا۔

حضرت ابراہیمؒ التیمی نے فرمایا: میں عالم تصور میں اپنے نفس کو جنت میں لے گیا اور اس کے پھل کھانے لگا۔ اس کی صاف شفاف نہروں کا پانی پیا اور وہاں کی حسین وجمیل دوشیزاؤں سے بغل گیر ہوتا رہا۔ بعد ازاں اپنے نفس کو دوزخ میں لے آیا جہاں اس کے کڑوے کسیلے پھل کھائے اس کے بدکرداروں کا لہو اور پیپ پینے کی کوشش کی اور طوق وسلاسل پہنے مبتلائے مصیبت رہا پھر میں نے اپنے نفس کو مخاطب کر کے کہا ان میں سے کون سا مقام تجھے مطلوب ہے؟ نفس نے جواب دیا میں سر دست دنیا میں رہ کر ہی کچھ اعمال صالح کرنا چاہتا ہوں اس پر آنجناب نے فرمایا تیری مراد پوری ہو گئی اب عمل ہی کئے جا۔

مذکورہ بالا احوال وواقعات یہ ثابت کرتے ہیں کہ ایمان ضمیر کو جھنجھوڑنے اور بیدار کرنے کی کیا صورتیں اختیار کرتا ہے جناب احنف بن قیس اس مقصد کیلئے ایک اور طریقہ اختیار فرمایا کرتے تھے۔ آپ چراغ کے پاس چلے جاتے اور چراغ کی او پر انگلی رکھ دیتے جب آگ اسے جلانے لگتی

تو آپ اپنے نفس سے کہتے۔ اے احنف گناہوں کی سزا ایسی آگ ہے فلاں دن تو نے جو (گناہ) کیا تھا تجھے اس پر کس چیز نے اکسایا؟ اور فلاں دن تو نے جو کچھ کیا اس پر کس چیز نے مجبور کیا؟ اس وقت آگ کا خوف نہ تھا۔؟؟

محاسبہ نفس کا ایک اور اسلوب وہ ہے جو توبتہ الصمتہ سے مروی ہے آپ نے نفس کا محاسبہ کرتے ہوئے اپنی عمر کا حساب لگایا تو وہ ساٹھ سال بنی پھر آپ نے ان سالوں کے دن گنے تو وہ اکیس ہزار پانچ سو ہوئے۔ اس پر آپ چیخ اٹھے اور گویا ہوئے ہائے افسوس...... 21000 گناہوں کو لے کر خدا کے دربار میں حاضر ہوں گا پھر خیال آیا کہ گناہوں کی یہ تعداد تو اس صورت میں ہے۔ اگر روزانہ ایک ہی گناہ کیا ہو۔ لیکن اپنا حال تو یہ ہے کہ ایک ایک دن میں ہزاروں گناہ سرزد ہوتے ہیں۔

اوپر ہم نے کہیں ذکر کیا ہے کہ ضمیر کے فیصلے کے نتیجے میں کبھی کبھی مادی سزا بھی آدمی کو مل جاتی ہے اور بیدار ضمیر انسان اسے بخوشی قبول کر لیتا ہے تو اس کی مثال حضرت ابوطلحہ انصاریؓ کا یہ واقعہ ہے کہ آپ ایک روز اپنے باغ میں نماز پڑھ رہے تھے۔ خوشگوار ماحول میں نماز پڑھتے وقت آپ کی توجہ شاخ ثمر پر بیٹھے ہوئے ایک پرندے کی طرف مبذول ہوگئی اور آپ کو تھوڑی دیر کے لئے احساس نہ رہا کہ آپ حالت نماز میں ہیں۔ بعد میں جب خیال آیا کہ بجائے اللہ کے، دل پرندے کی طرف مائل ہو رہا ہے تو آپ نے اس نقصان کا کفارہ یوں ادا کیا کہ پورے باغ ہی کو صدقہ کر ڈالا اور آئندہ کے لئے ایسے ہر نقصان سے محفوظ ہوگئے۔

✱✱*

نور ایمان سے منور ضمیر کا اعجاز

انسان خود اپنے وضع کردہ قوانین کی پابندی سے بھاگتا ہے اور ان کے اجراء ونفاذ پر ذاتی مفادات کے تحفظ کی خاطر سو طرح کی تدابیر سوچتا ہے مثال کے طور پر حکومتیں کاروبار سلطنت چلانے کیلئے ٹیکس عائد کرتی ہیں۔ امن عامہ بحال رکھنے اور معاشرتی جرائم کے سدباب کیلئے قانونی تعزیرات نافذ کرتی ہیں۔ آپس کے معاملات کو درست رکھنے کیلئے اور بیع وشرئی کے صحیح انعقاد کی خاطر اصول وضوابط طے کرتی ہیں۔ سیاست وحکمرانی کے باب میں ایسے اقدامات کی سختی سے ممانعت کر دی جاتی ہے جن سے ملک وقوم کا مفاد متاثر ہوتا ہے یہ سب کچھ کرنے کے بعد عملاً ہوتا یہ ہے کہ قوانین وضوابط کی کھلم کھلا مخالفت کی جاتی ہے۔ ٹیکسوں کی چوری اور جرائم کا ارتکاب سرعام ہوتا ہے۔ قانون کا احترام نہ حکام کرتے ہیں اور نہ عوام ہی اس کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہوتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ لوگ قوانین کی افادیت واہمیت کو سمجھنے کے باوجود ان سے انحراف کیوں کرتے ہیں؟ اس کا جواب صرف یہ ہے کہ ان کا ضمیر بیدار نہیں ہوتا اور اسے ایمان کی حرارت نصیب نہیں ہوتی، کیونکہ جو ضمیر ایمان کی بدولت بیدار ہو چکا ہو اس پر عقل عیار کا کوئی حیلہ کارگر نہیں ہو سکتا آیئے ذرا اسلامی تاریخ کے اوراق الٹ کر دیکھیں کہ نور ایمان سے منور قلوب وضمائر کس طرح زندگی کے ہر میدان میں انسان کی رہنمائی کرتے ہیں۔

حضرت اُبی بن کعبؓ فرماتے ہیں کہ رسول پاکؐ نے مجھے زکوٰۃ وصول کرنے کیلئے بھیجا۔ میں ایک آدمی کے پاس گیا۔ اور اسے اپنے تمام اونٹ جمع کرنے کیلئے کہا جب وہ سارے میرے سامنے کر دیئے گئے تو میں نے حساب لگا کر اسے بتایا کہ آپ کو صرف ایک سال کا بچہ بطور زکوٰۃ ادا کرنا ہوگا۔ اس نے کہا کہ ایک سال کا بچہ تو نہ دودھ دے گا نہ سواری کے قابل ہوگا آپ اس کے بجائے یہ جوان اور موٹی تازی اونٹنی لے جائیں۔ میں نے کہا کہ جس چیز کو لینے کا مجھے حکم نہیں دیا گیا اسے کیسے لے لوں؟ ہاں رسول اکرمؐ یہاں سے قریب ہی ہیں اگر آپ چاہیں تو حضورؐ کے پاس چلے جاتے ہیں۔ پھر اگر آپؐ نے اسے قبول کر لیا تو میں وصول کر لوں گا بصورت دیگر آپ کا مال آپ کو مبارک اس نے کہا ٹھیک ہے اور میرے ساتھ چل پڑا اور وہ اونٹنی جو مجھے دے رہا تھا

ساتھ لے لی۔ بارگاہ رسالتؐ میں پہنچ کر کہنے لگا۔ ''یا رسول اللہؐ آپ کا قاصد میرے پاس پہنچا تا کہ میرے مال کا صدقہ وصول کرے اور اس سے پیشتر میرے مال کا صدقہ وصول کرنے کیلئے نہ کبھی آپ تشریف لائے نہ آپ کا کوئی قاصد آیا میں نے اس کے سامنے اپنے سارے اونٹ پیش کر دیئے اس کا کہنا ہے کہ ایک سال کا بچہ ادا کروں۔ لیکن وہ تو اللہ کے رسولؐ نہ دودھ دینے کے قابل ہوتا ہے نہ سواری کے میں نے اس کے بجائے اسے ایک جوان موٹی تازی اونٹنی دی مگر یہ اسے لینے سے انکار کرتا ہے اونٹنی میں اپنے ساتھ لے آیا ہوں اے اللہ کے رسولؐ آپ قبول فرما لیں۔ اس پر رسول اللہؐ نے فرمایا۔ تمہارے ذمہ واجب الادا صدقہ تو وہ بچہ ہی ہے تاہم اگر تم زیادہ دینا چاہتے ہو تو اس کا اللہ آپ کو اجر دے گا اور ہم اسے قبول کر لیتے ہیں اس کے بعد آپ نے اس اونٹنی کو وصول کرنے کا حکم دے دیا اور اس صحابیؓ کے مال میں برکت کی دعا کی ...... آپ نے غور کیا اس واقعہ میں فریقین کے اندر کون سا مقدس جذبہ کار فرما ہے؟ یہ ضمیر کی آواز تھی اس ضمیر کی جس پر ایمان کا رنگ چڑھ چکا تھا۔

حضرت ماعزؓ بن مالک مشہور صحابی تھے ایک دفعہ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی یا رسولؐ میں نے اپنی جان پر ظلم کیا ہے اور زنا کر بیٹھا ہوں۔ اب چاہتا ہوں کہ آپؐ مجھے پاک کر دیں۔ رسول پاکؐ نے فرمایا شاید تو نے چھیڑ چھاڑ کی ہو یا بوس و کنار کی ہو۔ مگر حضرت ماعزؓ نے ہر بار تردید کی اور گناہ کا اعتراف کرتے رہے اور اس بات پر مصر رہے کہ حد جاری کر کے انہیں پاک کیا جائے بالآخر رسولؐ پاک نے انہیں رجم کرنے کا حکم صادر فرما دیا اور حضرت ماعزؓ نے اپنے اوپر بخوشی حد نافذ کرائی۔

اور یہ ایک مسلمان خاتون ہیں رسول پاکؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کرتی ہیں اے اللہ کے رسولؐ میں نے زنا کا ارتکاب کیا ہے مجھے پاک کر دیجئے۔ رسول اللہؐ اسے لوٹا دیتے ہیں مگر اگلے دن وہ پھر آ جاتی ہیں اور کہتی ہیں یا رسول اللہؐ آپ نے مجھے لوٹا دیا شاید آپ ماعز کی طرح مجھ پر سے حد ٹالنا چاہتے ہیں، بخدا میں حاملہ ہو گئی ہوں، آپؐ نے فرمایا کہ اگر یہ بات ہے تو اب چلی جا اور بچے کی پیدائش کے بعد آنا۔ عورت چلی گئی دن پر دن گزرتے گئے مگر اس کے ضمیر کی خلش نہ گئی۔ گناہ سے پاک ہونے کا خیال اسے ہر وقت مضطرب رکھتا آخر وضع حمل ہو گیا اور بچے کو لے

کر وہ ایک بار پھر دربار رسالتؐ میں حاضر ہو گئی۔ رسول اللہؐ نے فرمایا ابھی حد جاری نہیں کی جا سکتی جا اور اس بچے کو دودھ پلا اور جب زمانہ رضاعت گزر جائے اور بچہ روٹی وغیرہ کھانے لگے تو پھر آنا۔ بیدار ضمیر خاتون واپس چلی جاتی ہے اور پورے دو سال بچے کو دودھ پلاتی ہے مگر اس عرصے میں کبھی ایک لمحے کیلئے بھی اس کے دل و دماغ سے گناہ کا تصور محو نہیں ہوتا۔ وہ آخرت میں اس جرم کی سزا کا خیال کر کے کانپ کانپ جاتی ہے آخر جب بچے نے دودھ پینا چھوڑ دیا تو وہ اس کے ہاتھ میں روٹی کا ایک ٹکڑا دے کر رسول خداؐ کی خدمت میں پھر پہنچ گئی۔ یا رسول اللہؐ اب میرا بچہ دودھ نہیں پیتا۔ اب یہ کھانا کھانے لگا ہے۔ اس کے بعد اجرائے حد میں مزید تاخیر نہیں کی جا سکتی تھی چنانچہ آپؐ نے اسے رجم کرنے کا حکم دیدیا حضرت خالد بن ولید بھی ان لوگوں میں تھے جو اسے پتھر مار رہے تھے۔ انہوں نے اس کے سر پر پتھر مارا جس سے خون کے چھینٹے حضرت خالد کے چہرے پر جا پڑے اس پر ان کے منہ سے گالی نکل گئی اللہ کے نبیؐ نے سنا تو فرمایا۔ اے خالد رک جا۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے اس خاتون نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر اس کی توبہ کو مدینہ کے ستر گنہگاروں پر تقسیم کر دیا جائے تو سب کی مغفرت کے لئے کافی ہو کیا اس سے افضل بھی کسی کی توبہ ہو سکتی ہے؟ اس نے خدا کیلئے اپنی جان دیدی۔

کیا دنیا کے کسی قانون تعزیرات کی اس درجہ اطاعت کی گئی ہے؟ نہیں اور یقیناً نہیں دنیا کے قوانین کا نفاذ، فوج، پولیس، یا حکومت کے دوسرے اہلکاروں کے ہاتھوں بجبر و اکراہ ہوتا ہے جس سے بچاؤ کی کئی صورتیں اختیار کی جا سکتی ہیں۔ مگر اسلامی قانون کی تنقید پر ایک مومن کو اس کا ضمیر ہی مجبور کرتا ہے اور اس کی پکار پر لبیک کہنا ہی پڑتا ہے۔

اس کے بعد دو چار واقعات اور سنیئے جن کا تعلق امانت و دیانت اور حسن معاملہ سے ہے اور جن سے متعلق قوانین پر عمل درآمد ایمان و ضمیر کے ماسوا کوئی طاقت نہیں کرا سکتی۔

☆ امیر المومنین حضرت عمرؓ بن الخطاب نے حکم جاری کر دیا کہ اشیائے خوردنی میں ملاوٹ قابل تعزیر جرم ہے کوئی مسلمان مرد اور عورت یہ جرم نہ کرے کیونکہ رسول اللہؐ نے فرمایا ہے ''مَنْ غَشَّ فَلَيْسَ مِنَّا '' (جس نے دھوکا دیا وہ ہم میں سے نہیں) ادھر فاروقؓ اعظم کا یہ حکم تھا اور ادھر ایک عورت اپنی بیٹی سے کہہ رہی تھی دودھ میں پانی ڈال دو کچھ زیادہ پیسے وصول ہو جائیں

گے بیٹی نے ماں کو امیر المومنین کا حکم یاد دلایا تو ماں نے کہا امیر المومنین یہاں کہاں ہے؟ وہ ہمیں دیکھ تو نہیں رہا بیٹی نے جواب دیا اگر امیر المومنین ہمیں نہیں دیکھتا تو خدا تو ہمیں دیکھ رہا ہے اماں جان میں دودھ میں پانی ہرگز نہیں ملاؤں گی یہ اپنے مسلمان بھائیوں کے ساتھ دھوکا کرنا ہے یہ سنگین جرم ہے۔

مورخ طبری نے ذکر کیا ہے کہ جب مسلمان مدائن میں فاتحانہ داخل ہوئے تو انہوں نے مقبوضہ غنائم ایک جگہ جمع کر دیئے ایک صاحب آئے اور ایک بیش قیمت چیز خزانچی کو دے دی لوگوں نے کہا ایسی بہترین چیز تو ہم نے آج تک نہیں دیکھی اور ہمارے پاس موجود اشیاء میں کوئی بھی اس کے برابر نہیں آپ نے اس پر قبضہ کیا تھا۔ انہوں نے جواب دیا اگر خدا کا خوف نہ ہوتا تو کبھی اسے تمہارے پاس لیکر نہ آتا لوگوں نے سمجھ لیا کہ آدمی بڑے مرتبہ ومقام کا حامل ہے۔ استفسار کرنے لگے آپ کون ہیں؟ انہوں نے کہا میں یہ نہیں بتاؤں گا نہ آپ کو اور نہ کسی اور کو۔ آپ میری مدح وتعریف کرنے لگیں گے حالانکہ میں نے یہ کام صرف خدا کی رضا کے لئے کیا ہے اور وہی تمام تعریفوں کا مستحق ہے۔ لوگوں نے ایک آدمی کو اشارہ کیا کہ اس کے پیچھے پیچھے جاؤ اور اس کے ساتھیوں سے اس کا نام معلوم کرو۔ اس نے ایسا ہی کیا تو پتہ چلا کہ آنجناب عامر بن عبد قیس ہیں۔

حضرت عبداللہ بن دینار نے فرمایا کہ میں ایک مرتبہ امیر المومنین عمرؓ ابن الخطاب کے ہمراہ مکہ کی طرف روانہ ہوا، راستے میں ایک مقام پر ہم نے رات گزاری۔ وہاں پہاڑ پر سے ایک چرواہا ریوڑ سمیت نیچے اترا اور ہمارے پاس سے گزرا۔ امیر المومنین نے اسے کہا! اے چرواہے ان میں سے ایک بکری میرے ہاتھ فروخت کر دے اس نے جواب دیا میں غلام ہوں اور یہ آقا کا ریوڑ ہے آپ نے بربنائے آزمائش فرمایا اپنے آقا سے کہہ دینا کہ اسے بھیڑیا کھا گیا ہے چرواہا بولا اللہ کو کیا جواب دوں گا۔ اس پر عمرؓ رو پڑے اور صبح کے وقت اس غلام کے ساتھ گئے اور آقا سے خرید کر اسے آزاد کر دیا اور فرمایا اس کلمہ کی بدولت تجھے دنیا میں تو آزادی نصیب ہوگئی ہے میں امید کرتا ہوں کہ آخرت میں بھی یہ تجھے نجات دلا دے گا۔

اب ذرا امور سیاست وحکمرانی کی طرف آیئے اور دیکھیے کہ ایمان کا تربیت کردہ ضمیر کس

طرح مسند حکومت پر فروکش عمال کو راہ راست پر رکھتا ہے اور بااختیار ہونے کے باوجود ظلم وزیادتی کا ادنیٰ تصور بھی ان کے دماغ میں نہیں ابھرتا نہ قومی دولت پر خود کو متصرف پا کر خیانت وبدعہدی کا کوئی خیال ان کے دل میں پیدا ہوتا ہے۔

امیر المومنین عمرؓ بن الخطاب کے عہد خلافت میں ایک دفعہ قحط پڑ گیا آپ نے اس عرصے میں معمول کا کھانا ترک کر دیا اور تیل یا روغن کے ساتھ روٹی چبا لیتے نتیجۃً آپ کا رنگ سیاہ پڑ گیا۔ رفقائے کار نے یہ دیکھا تو عرض کیا اے امیر المومنین امور سلطنت کا بار آپ کے کاندھوں پر ہے آپ اکل وشرب کے معاملہ میں اتنا پرہیز نہ کریں۔ مبادا آپ کی صحت بالکل ہی جواب دے جائے اس پر آپ نے فرمایا:

بئس الوالی انا ان شحبت والناس جیاع.

میں بدترین قسم کا حکمران ہوں گا اگر خود سیر ہو کر کھاؤں اور لوگ بھوکے رہیں۔

اس زمانے میں آپ نے ایک دن اپنے خاندان کی ایک ننھی بچی دیکھی جو بھوک سے نڈھال ہو رہی تھی اور چلتے ہوئے گر پڑتی تھی آپ نے پوچھا یہ کون ہے؟ آپ کے بیٹے عبداللہ نے جواب دیا یہ میری بیٹی ہے فرمایا اس کو کیا ہے؟ حضرت عبداللہؓ نے کہا سامان خورد ونوش آپ کے قبضہ میں ہے جسے آپ نے ہم سے روک رکھا ہے اسی کا نتیجہ ہے جو آپ دیکھ رہے ہیں۔ بیٹے کی شکایت سنی تو آپ نے فرمایا عبداللہؓ میرے اور آپ کے درمیان فیصلہ کن چیز اللہ کی کتاب ہے بخدا میں آپ حضرات کو وہی چیز دے سکتا ہوں جس کا اللہ نے آپ کو حق دار بنایا ہے کیا تم یہ چاہتے ہو کہ دوسروں کو ان کے حقوق سے محروم کر کے تمہیں نوازتا رہوں اور یوں خدا وخلق کی نظروں میں خائن قرار پاؤں۔

امامؒ ابن کثیر نے ''البدایہ والنہایہ'' میں عمرؓ فاروق کے کارہائے نمایاں اور عظیم الشان فتوحات کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے آپ اللہ سے بہت زیادہ ڈرتے، سادہ زندگی بسر کرتے اور معمولی خوراک کھاتے تھے بایں ہمہ دین حق کے تقاضوں کو پورا کرنے میں بڑے مستعد اور شدید تھے۔ سادگی کا یہ عالم تھا کہ لباس میں خود چمڑے کے پیوند لگا لیتے۔ پانی سے بھرا ہوا مشکیزہ اٹھا لاتے۔ گدھے کی ننگی پشت پر سوار ہو جاتے بہت کم ہنستے اور کبھی کسی سے مذاق نہ کرتے۔ آپ کی

انگوٹھی پر یہ عبارت کندہ تھی۔

كَفٰى بِالْمَوْتِ وَاعِظاً يَاعُمَر   اے عمر تیرے لئے موت کا ناصح کافی ہے

اور یہ امیرالمومنین علیؓ ابن ابی طالب ہیں۔ جعدۃ بن ھبیرہ ان سے مخاطب ہے۔ اے امیرالمومنین دو آدمی آپ کے پاس آتے ہیں ان میں سے ایک آپ کو اپنے اہل وعیال اور مال ومنال سے زیادہ محبوب رکھتا ہے۔ جب کہ دوسرا آپ کی دشمنی میں اتنا بڑھا ہوا ہے کہ اس کا بس چلے تو آپ کو ذبح کر ڈالے مگر آپ ہیں کہ دشمن کے حق میں اور دوست کے خلاف فیصلہ صادر فرما دیتے ہیں حضرت علیؓ نے سن کر فرمایا جانبداری کا رویہ تو میں اس صورت میں اختیار کر سکتا ہوں جب ذاتی منفعت میرے پیش نظر ہو مگر میرے تو سب کام اللہ کیلئے ہوتے ہیں۔

امام شعبیؒ کہتے ہیں حضرت علیؓ کی زرہ گم ہوگئی آپ کو معلوم ہوا کہ وہ ایک عیسائی کے پاس ہے چنانچہ اسے عدالت میں طلب کیا گیا۔ حضرت علیؓ نے بیان دیا کہ یہ زرہ میری ہے میں نے اسے فروخت کیا ہے نہ ہدیۃً کسی کو دی ہے قاضی شریح نے عیسائی سے کہا امیرالمومنین نے جو کچھ بیان کیا ہے اس کے بارے تم کیا کہتے ہو۔ عیسائی نے جواب دیا زرہ میری ہے اور امیرالمومنین محض جھوٹ بول رہے ہیں قاضی نے جناب امیر کی طرف توجہ کی اور دریافت کیا آپ کوئی ثبوت؟ حضرت علیؓ مسکرادیئے اور فرمایا ثبوت تو میرے پاس کوئی نہیں۔ قاضی نے فیصلہ دیدیا کہ زرہ کا مالک عیسائی ہے۔ وہ زرہ لیکر چلا گیا، ابھی چند ہی قدم چلا تھا کہ پھر پلٹ آیا اور کہنے لگا میں گواہی دیتا ہوں کہ یہ عین انبیاء ورسل کی تعلیمات ہیں۔ امیرالمومنین عدالت کی طرف رجوع کرتے ہیں اور اپنے قاضی سے فیصلہ طلب فرماتے ہیں مگر قاضی ان کے حق میں فیصلہ کرنے کے بجائے ان کے خلاف فیصلہ کر دیتا ہے میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمدؐ اس کے بندے اور رسول ہیں اے امیرالمومنین اس میں کچھ شک نہیں کہ زرہ آپ ہی کی ہے۔ آپ صفین جا رہے تھے کہ راستے میں آپ سے گر گئی تھی۔ حضرت علیؓ نے یہ سنا تو فرمایا "اب جب کہ تم نے اسلام قبول کر لیا ہے جاؤ میں نے آپ کو یہ زرہ بخش دی۔"

یہ دولت ایمان سے مالا مال ضمیر تھا جو خلیفہ اور قاضی دونوں کی رہنمائی کر رہا تھا خلفاء نے کبھی یہ کوشش نہ کی کہ قوت کے بل بوتے پر اپنا حق وصول کریں یا قاضی پر کسی طرح کا اثر ڈالیں تا

کہ وہ فیصلہ ان کی مرضی کے مطابق دے۔ اسی طرح قاضی نے بھی یہ نہیں کیا کہ خلیفہ کی رضاجوئی کیلئے انصاف کا خون کرے اسے اگرچہ یقین تھا کہ خلیفہ سچ کہتا ہے مگر تقاضائے عدل وانصاف یہ تھا کہ امیر و مامور دونوں کے ساتھ قانون کے مطابق مساوی برتاؤ کیا جائے۔

اور یہ اموی خلیفہ حضرت عمر بن عبدالعزیز ہیں جن کے بارے میں مالکؒ بن دینار کہا کرتے تھے "لوگ کہتے ہیں کہ مالک بڑا پرہیزگار ہے۔ میں بھلا کیونکر پرہیزگار ہوا۔ پرہیزگار تو عمر بن عبدالعزیز ہیں جن کے پاس دنیا منہ کھولے ہوئے آئی مگر انہوں نے اسے جھڑک دیا۔

خلفائے بنی امیہ میں یہی وہ خلیفہ راشد تھے جن کے پاس صرف ایک قمیص تھی میلی ہو جاتی تو اسی کو دھونے کیلئے دے دیتے اور جب تک وہ خشک نہ ہو جاتی آپ گھر پر ہی قیام فرماتے ایک دن اپنے گھر تشریف لائے اور اہلیہ سے ایک درہم قرض مانگا تا کہ انگور خرید سکیں مگر محترمہ کے پاس بھی نام خدا ہی تھا۔ وہ کہاں سے دیتیں کہنے لگیں آپ اچھے امیرالمومنین ہیں آپ کے خزانوں میں انگور خریدنے کیلئے بھی کچھ نہیں اس پر آپ نے فرمایا "میرے لئے آج محروم رہنا گوارا اور آسان ہے بہ نسبت اس کے کہ کل نار جہنم کے طوق واغلال میری گردن میں ہوں۔

آپ نے اپنے مختصر سے دور حکمرانی میں اس امر کی بھرپور کوشش کی کہ مظالم کا سلسلہ بند کر دیں اور حق داروں کو ان کے غصب شدہ حقوق لوٹا دیں۔ ان کی طرف سے روزانہ ایک منادی یہ اعلان کیا کرتا تھا مقروض کہاں ہیں؟ تنگدست جو نکاح کے خواہش مند ہیں کہاں ہیں؟ یتامیٰ اور مساکین کہاں ہیں؟ میرے پاس آئیں تا کہ سب کی ضروریات پوری کر دوں اس بے نظیر عدل وانصاف، کمال درجہ کے زہد و پرہیزگاری اور شدید نفسانی ریاضت کے باوجود اللہ تعالیٰ سے گڑگڑا کر یہ دعا کیا کرتے تھے۔ "اے اللہ عمر میں یہ اہلیت نہیں کہ تیری رحمت کا حقدار ثابت ہو سکے۔ لیکن تیری رحمت اتنی وسیع ضرور ہے کہ اسے اپنے دامن میں ڈھانپ لے۔"

مسلمان امراء اور حکام کے اندر یہ خدا خوفی کہاں سے آئی تھی؟ وہ مفاد ملت کے پاسبان اور عدل وانصاف کے پیکر کیوں بن گئے تھے صرف اس لئے کہ اپنا احتساب آپ کرنا ان کا شعار تھا اور اسی خود احتسابی کا نام ضمیر ہے۔ ضمیر بیدار کے امثلہ وشواہد کا بیان کچھ طویل ہوتا جا رہا ہے لیکن ہم نے شروع میں عرض کیا تھا کہ زندگی کے ہر موڑ پر اور ہر میدان میں نور ایمان سے منور ضمیر

انسان کی راہنمائی کرتا ہے۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے بعض شعبہ ہائے حیات سے متعلق مثالیں ہم پیش کر چکے ہیں۔ اور بعض کا بیان ابھی باقی ہے۔

تجارت اور آپس کے لین دین میں ایک بندہ مومن کا ضمیر اسے کس حد تک آمادہ نفع وخیر خواہی رکھتا ہے اس کا اندازہ حسب ذیل واقعات سے کیجئے۔

امام غزالی نے احیاء العلوم میں نقل کیا ہے کہ حضرت یونس بن عبید پارچات فروخت کیا کرتے تھے ان کے پاس موجود بیش قیمت پارچات میں سے بعض کی قیمت چار سو درہم تھی اور بعض کی دو سو درہم آپ اپنے بھتیجے کو دکان پر بٹھا کر خود نماز پڑھنے کیلئے تشریف لے گئے ان کی عدم موجودگی میں ایک بدو آیا اور چار سو درہم والا حلہ طلب کیا۔ آپ کے بھتیجے نے دو سو درہم والا حلہ دکھایا جسے بدو نے پسند کیا اور خرید لیا ابھی وہ چند ہی قدم گیا تھا اور حُلّہ بھی اس کے ہاتھوں ہی میں تھا کہ سامنے سے حضرت یونس بن عبید آ گئے۔ آپ نے حلہ پہچان لیا اور سمجھ گئے کہ ان کی دکان سے خریدا گیا ہے پوچھا کتنے میں خریدا ہے؟ بدو نے کہا چار سو درہم میں آپ نے فرمایا مگر اس کی قیمت تو دو سو درہم ہے آؤ اور یہ حلہ واپس کردو۔ بدو نے جواب دیا مگر ہمارے علاقے میں تو اس کی قیمت پانچ سو درہم ہے اور میں چار سو میں خرید کر راضی ہوں حضرت عبید نے کہا بھائی میرے ساتھ آیئے دین میں نصیحت وخیر خواہی کو دنیا بھر کے مال ومنال سے بہتر قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ آپ اسے دکان پر لے آئے اور دو سو درہم واپس کئے اور اپنے بھتیجے کو ڈانٹتے ہوئے کہا کہ تمہیں شرم نہ آئی۔ سو فیصد منافع لیتے ہوئے تم نے خدا کا خوف نہ کیا۔ تمہیں مسلمانوں کی خیر خواہی کا مطلق خیال نہ آیا۔ بھتیجے نے کہا چچا جان! خدا کی قسم یہ صاحب تو چار سو درہم دے کر بھی راضی تھے مگر تم جو قیمت اپنے لئے پسند کرتے ہو وہی اس کیلئے کیوں نہ کی حضرت عبید نے جواب دیا۔

ہوسکتا ہے آپ سوچ رہے ہوں کہ خیر خواہی کا یہ احساس صرف قرون اولیٰ کے مسلمانوں کے اندر ہی موجود تھا یہ سوچ درست نہیں اس گئے گزرے زمانے میں بھی بہت سے روشن ضمیر ایسی اعلیٰ روایات کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی نے اپنے ایک مقالہ میں تحریر فرمایا کہ حجاز کے ایک ثقہ بزرگ سے مجھے معلوم ہوا کہ مکہ کے تجار اپنے کاروباری ساتھیوں کے ساتھ حددرجہ اخلاص وایثار کا برتاؤ

کرتے تھے اگر کسی تاجر کے پاس دن کے آخر حصے میں کوئی گاہک آتا اور تاجر یہ سمجھتا کہ آج میرا کافی مال فروخت ہوگیا ہے مگر فلاں دکان دار کی بکری بہت کم رہی ہے تو گاہک کو مشورہ دیتا کہ اس بازار میں فلاں دوکاندار کے پاس وہ مال موجود ہے جو آپ مجھ سے خریدنا چاہتے ہیں آپ براہ کرم وہاں تشریف لے جائیں یوں ہر تاجر دوسرے کی خیر خواہی کرتا۔

آخر میں ایک دو واقعات بذل وانفاق کے بھی سن لیجئے جن سے پتہ چلتا ہے کہ ایک باایمان اور باضمیر شخص کے نزدیک مال ودولت دنیا کی کوئی وقعت نہیں وہ اپنی ذات پر خرچ کرنے کے بجائے دوسروں پر خرچ کرکے زیادہ راحت اور خوشی محسوس کرتا ہے۔ امام مالک نے موطا میں حضرت عائشہؓ کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ ایک مسکین نے حضرت عائشہؓ سے سوال کیا جب کہ آپ روزہ سے تھیں اور گھر میں سوائے ایک روٹی کے اور کچھ نہ تھا آپ نے اپنی کنیز کو حکم دیا کہ جاؤ اسے وہ روٹی دے دو۔ اس نے کہا تو پھر روزہ افطار کرنے کیلئے آپ کے واسطے کچھ نہ رہے گا آپ نے فرمایا بس اسے وہ روٹی دے دو چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا ممکن ہے کوئی آدمی یہ خیال کرے کہ روٹی معمولی چیز تھی اس لئے آپ نے اپنی ذات پر مسکین کو ترجیح دی تو ایسے حضرات کیلئے ہم ام المومنین حضرت عائشہؓ ہی کا ایک اور واقعہ بیان کرتے ہیں۔

حضرت معاویہؓ نے ایک دفعہ اَسّی ہزار درہم حضرت عائشہؓ کی خدمت میں بھجوائے۔ اس وقت بھی آپ روزہ سے تھیں اور ایک پرانا سا لباس آپ نے زیب تن کر رکھا تھا۔ درہم وصول کرنے کے بعد اسی وقت حضرت عائشہؓ نے انہیں فقرا اور مساکین میں تقسیم کرنا شروع کردیا۔ یہاں تک کہ ایک درہم بھی باقی نہ رہا۔ ان کی خادمہ نے کہا ''ام المومنین آپ ایک دو درہم کا گوشت ہی خرید لیتیں تاکہ ہمارے لئے رات کا کھانا تیار ہو جاتا اور آپ کی افطاری کا سامان بھی۔ اُمّ المومنین نے فرمایا بیٹی پہلے ذکر کیا ہوتا تاکہ میں کچھ بچالیتی۔'' تو آپ نے غور فرمایا کہ وہ روزہ دار ہستی جس نے ایک روٹی کے لئے اپنے اوپر ایک مسکین کو ترجیح دی جب اس کے قبضہ میں اسی ہزار درہم آئے تو اس وقت بھی فقراء ومساکین ہی کو اپنی ذات پر مقدم رکھا۔

امیر المومنین حضرت عمرؓ بن الخطاب نے چار سو دینار ایک تھیلی میں باندھ کر اپنے لڑکے سے کہا انہیں ابو عبیدہؓ بن الجراح کو میری طرف سے دینا، پھر دیکھنا وہ اس رقم کو کیا کرتے ہیں۔ لڑکا

ان کی خدمت میں پہنچا اور عرض کی امیر المومنین نے فرمایا ہے کہ آپ یہ رقم قبول فرمائیں اور اپنی کوئی ضرورت پوری کرلیں حضرت ابوعبیدہؓ نے کہا اللہ امیر المومنین پر رحم فرمائے اور انہیں میل ملاپ کی توفیق دے رکھے۔ بعد ازاں انہوں نے ایک لڑکی کو بلایا اور اسے حکم دیا کہ یہ سات دینار فلاں آدمی کو دے آؤ۔ اور یہ پانچ دینار فلاں صاحب کیلئے لے جاؤ اور یہ پانچ فلاں کیلئے اسی طرح بھجواتے گئے تا آنکہ سب ختم ہوگئے لڑکا واپس آیا اور حضرت عمرؓ کو اس کی خبر دی کیا دیکھتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے اتنے ہی دینار حضرت معاذ بن جبلؓ کیلئے گن رکھے ہیں لڑکے سے کہا جاؤ یہ چار سو دینار معاذؓ بن جبل کو دو اور پھر گھر کے کسی کام کاج میں مشغول ہو جانا اور دیکھنا کہ وہ اس رقم کو کیا کرتے ہیں؟ لڑکا ان کی خدمت میں پہنچا اور عرض کی امیر المومنین فرماتے ہیں اس رقم کو اپنی کسی ضرورت کے پورا کرنے میں صرف کرلیں۔ آپ نے رقم قبول فرمالی اور کہا اللہ امیر المومنین پر رحم فرمائے اور انہیں ربط و تعلق قائم رکھنے کی توفیق عطا فرمائے پھر ایک لڑکی کو بلایا اور حکم دیا جاؤ فلاں آدمی کے گھر اتنے دینار دے آؤ۔ فلاں آدمی کے گھر اتنے اور فلاں کے گھر اتنے۔ آپ تقسیم فرما رہے تھے کہ آپ کی اہلیہ کو خبر ہوئی انہوں نے آکر کہا واللہ ہم بھی تو غریب ہیں ہمیں بھی کچھ دیجئے اس وقت کپڑے میں صرف دو دینار رہ گئے تھے۔ حضرت معاذؓ نے وہ گھر والوں کی طرف پھینک دیئے۔ لڑکے نے جا کر ان کے متعلق بھی اطلاع دی۔ سن کر امیر المومنین بہت خوش ہوئے اور فرمایا یہ سب بھائی بھائی ہیں ایک دوسرے کے مشابہ اور ایک دوسرے کیلئے مثال۔

ایک دفعہ حضرت عبدالرحمان بن عوفؓ کا قافلہ تجارت مدینے میں وارد ہوا قافلہ اتنا بڑا تھا کہ پورے مدینے میں ہلچل مچ گئی۔ حضرت عائشہؓ نے شوروغوغا سنا تو پوچھا کیا ماجرا ہے؟ انہیں بتایا گیا کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کا قافلہ تجارت ہے اس پر حضرت عائشہؓ نے حدیث فرمائی کہ میں نے رسول اللہؐ سے سنا۔ آپ فرما رہے تھے کہ میں ایسے دیکھتا ہوں جیسے میں اور عبدالرحمٰن بن عوفؓ پل صراط پر اکٹھے ہوں عبدالرحمان نیچے کی طرف مائل ہونے لگتے ہیں مگر پھر سیدھے ہو جاتے ہیں یہاں تک کہ بچ جاتے ہیں اگرچہ قریب تھا کہ...... جب یہ حدیث حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کو پہنچی تو انہوں نے فرمایا جتنے اونٹ سامان تجارت لے کر آئے ہیں، یہ سب اور ان پر جو سامان تجارت لدا ہوا ہے وہ بھی اللہ کی راہ میں صدقہ کرتا ہوں، راوی نے بیان کیا کہ جو سامان

تجارت اونٹوں پر لدا ہوا تھا وہ اونٹوں سے زیادہ مالیت کا تھا اور اونٹوں کی تعداد پانچ سو تھی۔

امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں لکھا کہ نبیؐ کے اصحاب میں سے ایک صاحب کی خدمت میں بکری کی سری ہدیۃً بھیجی گئی۔ انہوں نے قبول کرلی، پھر فرمایا فلاں آدمی مجھ سے زیادہ ضرورت مند ہے چنانچہ اس کی طرف بھیج دی۔ انہوں نے قبول کر کے ایک اور صاحب کی طرف بھجوا دی جو ان کے خیال میں زیادہ حاجت مند تھا۔ اس طرح ہر وصول کرنے والا بکری کی سری کو آگے بھیجتا رہا حتیٰ کہ وہ پلٹ کر پھر پہلے صحابیؓ کے پاس پہنچ گئی۔

اہل ایمان کا یہ بذل و انفاق اور اپنی ضرورت پر دوسروں کی ضرورت کو مقدم رکھنے کا احساس ایمان و ضمیر ہی کی بدولت پیدا ہوتا ہے اور اسی کی پیہم ترغیب و تحریک سے برقرار رہتا ہے۔

*****

ایمان ایک زبردست داعیہ اصلاح

اعتراف حقیقت:۔

قلوب وضمائر کے تزکیہ اور اخلاق فاضلہ کی تربیت میں دین وایمان کے اثرات کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔اس حقیقت کا اعتراف ارباب دین ہی نہیں بہت سے ملحدین اور منکرین خدا نے بھی کیا ہے مثال کے طور پر ہم چند ایک منصف مزاج اکابر کے اقوال ذیل میں درج کرتے ہیں۔بنیامین کید KAD نے کہا ہے کہ تمام تمدنوں کی بنیاد میں اخروی جزا وسزا کے وہ تصورات کارفرما ہیں جنہیں تکمیل اخلاق کیلئے دین نے پیش کیا ہے۔دستوفسکی۔جو دنیا کا سب سے بڑا ناول نگار ہے.....کی کتنی ہی تحریریں ایسی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ کو چھوڑ دینے کے بعد انسان شیاطین سے تعلق جوڑ لیتا ہے ایک ملحد کی رائے میں دین ہے تو خرافات (معاذ اللہ) مگر اس کے بغیر زندگی ٹھیک طرح بسر نہیں ہوتی اور ایک دوسرے ملحد کا قول ہے کہ اگر اللہ موجود نہ ہوتا تو ہمارا فرض تھا کہ اسے ایجاد کر لیتے کیونکہ نفس انسانی پر اس کے خوشگوار اثرات مرتب ہوتے ہیں۔مشہور فرانسیسی ادیب گولیتر کہتا ہے کہ اللہ کے وجود میں شک کیوں کرتے ہو وہ اگر موجود نہ ہوتا تو میری بیوی میری عزت وناموس میں خیانت کرتی اور میرا خادم میرا مال چرا لے جاتا۔ایک منکر خدا کے تاثرات کچھ یوں ہیں میں اگرچہ جہنم کے وجود کو تسلیم نہیں کرتا تاہم اس بات کا اقرار ضرور کرتا ہوں کہ جہنم کی فکر بے شمار انسانوں کو برائی کے ارتکاب سے باز رکھتی ہے۔نوجوانوں کو اگر معلوم ہو جائے کہ جہنم کی حقیقت کچھ نہیں تو وہ بڑے سے بڑا سنگین جرم بھی معمولی خیال کرنے لگیں نیز یہ کہ اخلاق کا کام یہ ہے کہ وہ جز کے مقابل کل کی مکمل تصویر لے آتا ہے اور حال کے سامنے مستقبل کو لا کھڑا کرتا ہے اور یہ صحت اعمال......جس کا اہتمام صرف دین کرتا ہے......کے بغیر ممکن نہیں۔

دین کے بارے میں ہوفدنج کی رائے یہ ہے کہ دین بہترین اقدار حیات کے تحفظ کا نام ہے اس کی جزا وسزا کے بغیر اخلاق ایک فرضی چیز قرار پاتا ہے اور ادائے فرض کا احساس زائل ہو جاتا ہے اور ہر نوجوان اپنے علم وزکا کو حیلے بہانے سوچنے کیلئے وقف کردیتا ہے۔

ایک شبہ کا ازالہ:۔

تعمیر سیرت اور تربیت اخلاق کیلئے دین کے اثرات کا یہ کھلا اعتراف موحدین اور ملحدین سب کے ہاں ملتا ہے لیکن بعض کج فطرت لوگ ایسے بھی ہیں جو یہ کہتے سنے جاتے ہیں کہ تربیت کی غرض سے خدا اور آخرت کا خوف انسانی قلوب واذہان پہ بٹھانا دراصل آزاد اور خود مختار شخصیت کے نشو ونما میں رکاوٹ ڈالنا ہے۔

ان حضرات کی خدمت میں ہم یہ عرض کریں گے کہ تربیت میں سے خوف کے عنصر کو مطلق طور پر نکالنے کا ادعا ایک ادعائے باطل اور خیال موہوم ہے۔تربیت کیلئے کسی نہ کسی کا خوف ناگزیر ہے باپ کا خوف ماں کا خوف، استاد کا خوف، برادری کا خوف، محلے اور معاشرے کا خوف، اہانت وتذلیل کا خوف، تاریک مستقبل کا خوف یا قانون اور حکومت کا خوف پس جب یہ حقیقت ہے کہ خوف انسانی شخصیت کے صحیح ارتقاء کیلئے ضروری ہے تو پھر کسی دوسرے کے خوف کے بجائے اللہ خالق السموٰت والارض، مالک الملک اور احکم الحاکمین کا خوف ہی کیوں نہ ہو؟

فلا تخشوا الناس واخشون   اللہ کا خوف ہی سب سے بہتر خوف ہے

کیونکہ اللہ تعالیٰ جابر وقاہر ہی نہیں علیم وحکیم اور غفور ورحیم بھی ہے۔دوسروں سے سخت گیری اور ظلم وزیادتی کا خدشہ ہوسکتا ہے مگر اللہ تعالیٰ سے نہیں کہ ذات حق کا ہر کام علم وحکمت اور عدل ورحمت پر مبنی ہوتا ہے۔"رَحْمَتِیْ وَسِعَتْ کُلَّ شَیْئٍ"

ڈاکٹر ہنری لنگ کی شہادت:۔

دین وایمان کے طریق تربیت پہ اعتراض وارد کرنے والوں کو ہم اپنی طرف سے جواب دینے کے بجائے ڈاکٹر ہنری لنگ کی تصنیفات پہ غور کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔ڈاکٹر موصوف امریکہ کے ممتاز نفسیاتی معالج ہیں انہوں نے اپنی کتاب "العودۃ الی الایمان" میں جدید نفسیاتی مکاتب فکر کی طرف سے پیش کردہ ایسے ہی بعض نظریات کی غلطی واضح کی ہے آپ رقم طراز ہیں۔

بچوں کی تربیت نہایت مشکل کام ہے۔اس میں حیات انسانی کے متعدد داخلی اور خارجی امور پیش نظر رکھنے پڑتے ہیں۔لیکن اس اہم فرض سے عہدہ برآ ہونے کیلئے عام طور پر والدین

بعض غلط افکار ونظریات کے زیراثر شدید کوتاہیوں کے مرتکب ہوتے ہیں کوئی یہ سمجھتا ہے کہ بچے کو بدنی سزا بالکل نہیں ملنی چاہیے کیونکہ یہ نفسیاتی لحاظ سے مضر ہے کسی کا خیال ہے کہ بچے کو ایسا کام کرنے کیلئے کہا جائے جس میں سختی کرنے کی نوبت نہ آئے نیز یہ کہ بچے کو جھڑکنا جائز نہیں بلکہ اسے موقع دیا جائے کہ وہ اپنا مدعا بیان کر سکے یا یہ نظریہ کہ بعض بچے پیدائشی طور پر متعصب اور حساس ہوتے ہیں ان سے وہ کام نہ کرائے جائیں جو دوسرے بچے باآسانی کر دیتے ہیں ڈاکٹر ہنری لنگ فرماتے ہیں کہ ان میں سے کوئی نظریہ بھی کسی علمی یا نفسیاتی دلیل کی رو سے درست نہیں۔ آگے چل کر ڈاکٹر مذکور کہتے ہیں، بعض والدین کو ہم بڑبڑاتے ہوئے سنتے ہیں کہ وہ اپنے بچوں کو مساجد یا دینی مدارس میں نہیں بھیجیں گے ان کے خیال میں وہ بڑے ہو کر بغیر کسی تکلیف کے مروجہ چیزوں کا ادراک کر لیں گے۔ آپ کا کیا خیال ہے یہ بچے شعور کی اس منزل کو پہنچ سکیں گے جہاں ان کیلئے خطا وصواب میں امتیاز کرنا ممکن ہو جائے گا؟ اور کیا یہ ان نمایاں اخلاقی نمونوں کو مان جائیں گے جنہیں ہم اپنے عہد طفلی میں تسلیم کر چکے ہیں۔ ہم اس سے پہلے بیان کر چکے ہیں کہ بعض اعمال غلط ہوتے ہیں اور بعض دوسرے صحیح اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی حقیقت بیان کر دی ہے۔ صحیح وغلط کو معلوم کرنے کا یہ طریق...... کتاب اللہ کی طرف رجوع کرنے کا بالکل ابتدائی اور فطری ہے اس سے اعمال کے حسن وقبح کا پتہ بہر حال چل جاتا ہے۔ اس شعور کے بعد ہمارے کرنے کا کام صرف یہ رہ جاتا ہے کہ اپنے بچوں کو بتا دیں کہ از روئے کتاب الٰہی یہ کام غلط ہے اور وہ صحیح اس سے بچے ذہنی طور پر قائل ہو جاتے ہیں کیونکہ ہماری اپنی رائے بھی وہی ہوتی ہے اور معاشرہ بھی اسسے اتفاق کر چکا ہوتا ہے۔ اب اگر کوئی صحیح وغلط کے اس معیار کو روکتا ہے تو کیا ماحول یا معاشرے میں کہیں سے اسے کوئی تائید ملے گی؟ یا ماحول کا دباؤ اس کے ساتھ ہوگا؟ نہیں کبھی نہیں۔ پھر کیا زندگی کی بنیادی اخلاقی اقدار، دینی عقائد کے علاوہ کسی اور جگہ سے ہمارے بچے حاصل کر سکتے ہیں؟ نہیں یقیناً نہیں ہمارے بچوں کی اخلاقی تربیت انہی اخلاقی اقدار کے پیش نظر رہنے سے ہو سکتی ہے چاہے ہم ان اقدار کے خدائی مصدر وماخذ کو قبول کریں یا نہ کریں۔

ڈاکٹر ہنری لنگ مزید لکھتے ہیں مختلف اور متضاد طبیعتوں کے حامل بچوں میں پاکیزہ عادات راسخ کرنے کیلئے ہر وہ ذریعہ اختیار کرنا ضروری ہے جو موثر ہو اور قدرے جبر واکراہ پر مبنی ہوتا کہ

بلا تاخیر اوصاف حمیدہ کا اکتساب کیا جا سکے اور واقعہ یہ ہے کہ والدین کی بہت بڑی اکثریت نے اس مقصد کیلئے دیندار اکابر کے نصائح کی شدید احتیاج محسوس کی ہے اور اپنے بچوں میں محاسن اخلاق پیدا کرنے میں انہیں بہت مفید اور مددگار پایا ہے۔"

"عقلی اور نفسیاتی لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو سب سے بڑا ذریعہ اصلاح خود دین ہے کیونکہ اللہ کے وجود پہ ایمان اس کے رسولوں اور کتابوں پہ ایمان اور آخرت کی جزاء سزا کا یقین اتنا مضبوط حصار ہے کہ تربیت اخلاق کے دوران والدین اس کی بجا طور پر پناہ لے سکتے ہیں اور اس طرح انہیں بچوں پر وہ قدرت اور بالادستی نصیب ہو جاتی ہے جس کے بغیر کار اصلاح وتربیت پایہ تکمیل تک نہیں پہنچ سکتا۔"

"وہ آباء جو سوال کرتے ہیں کہ ان کی اولاد میں اچھے اخلاق کیسے پیدا ہوں؟ جبکہ وہ دیکھ رہے ہوں کہ ان میں دینی تعلیمات اور اثرات کی بہت کمی ہے۔ وہ اخلاق جو بیشتر ازیں خود ان کی اخلاقی تربیت کر چکے ہوتے ہیں تو ایسے آبا، فی الحقیقت ایک بڑی مشکل سے دوچار ہوتے ہیں۔ ایسی مشکل جس کا کوئی حل نہیں کیونکہ تربیت اخلاق کیلئے کوئی چیز تعلیمات دین کا بدل قرار نہیں پا سکتی۔"

"دین ہی وہ واحد قوت ہے جو ان اخلاقی وعقلی مسائل کے حل کیلئے مُمد ومعاون ثابت ہو سکتی ہے جنہوں نے والدین، اولاد اور پورے معاشرے کو پریشان کر رکھا ہے اور جن کی بدولت یہ دنیا ایک دنیائے تغیر واضطراب بن چکی ہے۔ اس میں ٹھہراؤ اور سکون اس وقت پیدا ہو سکتا ہے جب انسان خدائے حیؐ وقیوم کا دامن پکڑ لے گا کیونکہ صرف وہی ذات امن وسلامتی کا منبع اور تبدیل وتغیر سے منزہ ہے۔"

دینی اسباق پڑھنے اور مساجد میں آنے جانے سے بچے کے قلب وضمیر پہ جو گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں انہیں ڈاکٹر ہنری لنگ اپنے تجربات کی روشنی میں بیان کرتے ہیں ملاحظہ فرمایئے۔

مکاتب ومساجد اور دینی مواعظ ونصائح کے عیوب ونقائص چاہے کتنے ہی کیوں نہ ہوں یہ بات بجائے خود حقیقت ہے کہ یہ ادارے بچوں میں خطا وصواب کی تمیز پیدا کرنے والی صحیح بنیادیں

فراہم کرنے میں ہماری مدد کرتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح جیسے ان کی بدولت ایمان باللہ اور اخلاق اللہ کا اصل الاصول کی حیثیت سے اعتقاد راسخ ہوتا ہے لہٰذا ماں باپ اور معاشرہ و ماحول کیلئے یہ ادارے عظیم افادیت کے حامل ہیں تجربہ بتاتا ہے کہ وہ بچہ جو دینی اسباق پڑھتا ہے بلحاظ اوصاف اس بچے سے بدرجہا افضل و اعلیٰ ہوتا ہے جو مسجد میں نہیں جاتا اور تعلیمات دین سے بے بہرہ رہتا ہے میں یہ بات سن سنا کر نہیں کر رہا ہوں بلکہ پورے دس ہزار افراد کی زندگیوں کا مطالعہ کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ مراکز عبادت کی طرف رجوع کرنے والے اصحاب کی شخصیت دوسرے لوگوں کے مقابلے میں بہتر اوصاف سے متصف ہوتی ہے۔''

ڈاکٹر موصوف اسی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ وہ مزید یہ بھی کہتے ہیں کہ بچے کو تعلیمات دین ذہن نشین کرانے کا صحیح وقت وہ ہوتا ہے جب وہ انہیں سمجھے بغیر قبول کر لیتا ہو کیوں کہ اس عمر میں بچے کے جذبات و احساسات بلند اقدار کے سامنے سرخمیدہ ہوتے ہیں لیکن اگر والدین اپنے بچوں کو پختگی کی عمر میں داخل ہونے کے بعد دینی اسباق کی طرف راغب کرنے کی کوشش کریں تو یہ ایک خطرناک اصول کی پیروی ہوگی کیونکہ جب بچہ ماحول کی ہر بات کو سمجھنے لگتا ہے اس وقت بہت سے فاسد اور باطل امور اس پہ اثر انداز ہو رہے ہوتے ہیں اس وقت اصلاح کی کوشش بالعموم کامیاب نہیں ہوتی۔ اصلاح کا وقت تو عمر کے وہی قیمتی سال تھے جنہیں وہ ضائع کر چکا۔

ضمیر بلا ایمان کی حقیقت:۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ تربیت اخلاق کیلئے ضمیر اپنی مجرد حیثیت میں بالکل کافی ہے اور اس کام کیلئے دین و ایمان کی کوئی ضرورت نہیں دوسرے لفظوں میں وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ محض ضمیر، دین و ایمان کا بدل بن سکتا ہے اس کے جواب میں ہم یہ عرض کریں گے کہ یہ خیال باطل ہے۔ اس لئے کہ زندہ اور راہنمائی کے قابل ضمیر صرف وہی ہوتا ہے جسے تعلیمات دین نے مسائل حیات کا مکمل شعور بخشا ہو۔ جو حدود حلال و حرام سے پوری طرح باخبر ہو اور خطاء و صواب میں امتیاز کر سکتا ہو جس کی آواز ہر حال میں صداقت پر مبنی ہو اور جو بہر قیمت اصولوں کی پاسبانی کرتا ہو، ان اوصاف سے متصف وہی ضمیر ہوتا ہے جو نور ایمان سے منور ہو۔ نور ایمان سے محروم ضمیر کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے استاذ اندریر کریسن رقم طراز ہے تمام خطہ ہائے

ارضی کے رہنے والے تمام ادوار میں ضمیر کی آواز کو سنتے رہے ہیں مگر ان کے قلوب و ضمائر کبھی ہم آہنگ نہیں پائے گئے بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک زمانہ کے لوگ ایک چیز کو عین عدل اور سراپا خیر سمجھتے ہیں مگر بعد کے کسی دور میں اسی چیز کو کچھ دوسرے حضرات منافی عدل اور خیر سے یکسر تہی قرار دینے لگتے ہیں مثال کے طور پر عہد قدیم کے یونانی غلامی کو جائز سمجھتے تھے اور ان کے بہترین دل و دماغ بہائم کی طرح مردوں عورتوں اور بچوں کی خرید و فروخت کو بالکل فطری اور طبعی عمل سمجھتے تھے۔ قدیم روما کے قوانین دیگر مال و اسباب کی طرح بیوی بچوں کو بھی شوہر کی ملکیت قرار دیتے تھے اور بچوں کے باپ کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ اپنی نومولود بچی کو مارکیٹ میں لے جائے اور فروخت کر دے بشرطیکہ اس کی کوئی اور بچی موجود ہو تو یہ اپنے دور کے مہذب معاشروں کا حال تھا۔ ان لوگوں کا ضمیر انسانوں کی خرید و فروخت جیسے جرم پر انہیں ملامت نہ کرتا تھا۔ دوسری طرف قرون اولیٰ کے مسلمانوں کا حال سنیئے یہ بزرگ ارتکاب جرم کے خیال کو بھی گناہ سمجھتے تھے۔ حقوق العباد کی ان کے نزدیک اتنی اہمیت تھی کہ معمولی سا سلب و نہب بھی سنگین سزا پر منتج ہوتا اور آزاد انسانوں کی خرید و فروخت بھی ان کے ہاں نہایت قبیح فعل اور خلاف قانون اقدام تھا کہنے کا منشا یہ ہے کہ دین و ایمان کی روشنی کے بغیر ضمیر انسانی صحیح راہنمائی کے قابل نہیں ہوتا۔ یکساں نوعیت کے اعمال و افکار کے بارے میں تمدنی و معاشرتی حالات بدل جانے سے اس کی رائے میں بھی تبدیلی آجاتی ہے دور کیوں جائیں عربوں ہی کو دیکھ لیجئے دور جاہلیت میں ان کا رہن سہن ان کی پسند و ناپسند اور ان کے صحیح و غلط کا معیار کچھ اور تھا۔ وہ شراب و قمار کے دلدادہ تھے حرام خوری اور حرام کاری سے ان کی طبیعت ابا نہ کرتی تھی اپنی معصوم بچیوں کو زندہ درگور کرنے میں انہیں کوئی قباحت محسوس نہ ہوتی تھی۔ عورتوں پر ظلم و ستم کرنا، یتیموں کا مال کھانا اور ذرا ذرا سی بات پر قتل و غارت گری پہ اتر آنا ان کے روزمرہ کے مشاغل تھے۔ ان تمام اعمال شنیع کا ارتکاب دن رات کرنے کے باوجود ان کا ضمیر کبھی ملامت نہ کرتا مگر یہی عرب جب حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔ اور دین فطرت کی تعلیمات کو جذب کرنے لگے تو ان کی زندگیوں کا رنگ ہی بدل گیا ہے اب ان کے خوب و ناخوب کا پیمانہ پہلے سے یکسر مختلف تھا اور اب ان کے ضمیر کی آواز وہ نہیں تھی جسے یہ کبھی سنا کرتے تھے۔

صدائے ضمیر کا یہ اختلاف اس حقیقت کے اثبات کیلئے بالکل کافی ہے کہ ضمیر اپنی مطلق

حیثیت میں فضائل اخلاق اور اعمال حسن کی اساس نہیں بن سکتا۔

بلاشبہ ضمیر ایک فطری قوت ہے اور ایک ملکہ تمیز سے عبارت ہے مگر اس ملکہ کو معصوم قرار نہیں دیا جاسکتا۔ فرد کی زندگی میں عمر کے اختلاف سے ایک ماحول سے دوسرے ماحول میں منتقل ہو جانے سے عقل وشعور کے ترقی کر جانے سے، تہذیبی وتمدنی اثرات مرتب ہونے سے اور رفقاء واحباب کی تبدیلی سے اس فطری قوت کے اندازے اور تخمینے بھی بدل جاتے ہیں اس کی سوچ کا رنگ کچھ اور ہو جاتا ہے۔ حالات کے تغیر وتبدل سے ملکہ تمیز کے ادراکات واحساسات میں زمین آسمان کا فرق پڑ جاتا ہے اور کسی ایک حالت پر باقی نہیں رہتے۔ انہیں قرار وثبات اور صحت وصواب سے ہمکنار کرنے کیلئے ضروری ہے کہ اس فطری قوت اور ملکہ تمیز...... یعنی ضمیر انسانی...... کو کسی ٹھوس اور پائیدار حقیقت سے مربوط ومنسلک کر دیا جائے۔ ایسی حقیقت جو معصوم ہو اور ہر شائبہ عیب وخطا سے پاک ہو وہ دین وایمان ہی ہوسکتی ہے۔ پس ثابت ہو گیا کہ دین ایمان کے بغیر ضمیر ایک بے معنی چیز ہے۔

*****

اجتماعی اخلاق کے چند نمایاں پہلو

معاشرتی زندگی میں جو اوصاف حمیدہ ایک انسان میں ایمان کی بدولت پیدا ہوتے ہیں ان میں انفاق وایثار نہایت نمایاں وصف ہے فطری طور پر ہر انسان میں انانیت کا جذبہ موجود ہوتا ہے اور ہر کوئی ذاتی مفاد کا حریص ہوتا ہے یہاں تک کہ جوں جوں آدمی بوڑھا ہوتا ہے اس کی حریص اور خواہشات نفس جوان ہوتی جاتی ہیں۔ خود خالق کائنات نے انسان کی اس کمزوری کی نشاندہی کرتے ہوئے فرمایا۔ ''وَكَانَ الْإِنسَانُ قَتُورًا'' اور انسان بڑا تنگ دل واقع ہوا ہے۔ نیز یہ کہ ''وَاحضرت الانفس الشخ'' نفس تنگ دلی وبخل کی طرف جلدی مائل ہو جاتے ہیں۔ اور رسول مقبول کا فرمان ہے۔ ''لو کان لابن آدم وادیان من ذھب لا بتغی ثالثا'' اگر آدم کے بیٹے کے پاس سونے سے معمور دو وادیاں موجود ہوں پھر بھی وہ کسی تیسری وادی کی تلاش میں سرگرداں ہوگا۔ ذاتی منفعت کا یہی وہ رجحان ہے جس کے زیر اثر لوگ اپنے حقوق کو تو یاد رکھتے ہیں مگر اپنے فرائض کو یکسر بھلا دیتے ہیں اور پھر بخل وحرص کی یہ ذہنیت معاشرتی زندگی میں داخل ہوتی ہے تو ایک دنیا کی دنیا نفسی نفسی پکارتی نظر آتی ہے مگر امتی امتی کہنے والا کوئی نہیں ملتا۔

اپنی ذات کو نفع پہنچانے کی غرض وغایت یہ ہوتی ہے کہ دنیا کی زندگی آرام اور سکون کے ساتھ گزرے، دکھ درد اور تکلیف میں دوسرے مبتلا ہوں تو ہوں مگر مجھے کوئی اذیت نہ پہنچے جب تحفظ ذات کا یہ جذبہ اپنی فطری حد سے تجاوز کر جاتا ہے تو انسان کے اندر خود غرضی پیدا ہو جاتی ہے اور اسکے نتیجے میں ترقی وعظمت خاک میں مل جاتی ہے اور مدنیت وحضارة پر اضمحلال طاری ہو جاتا ہے۔

اس کے برعکس جو معاشرہ مجد وبزرگی کو فروغ دینا چاہتا ہے اور تہذیب وتمدن کی ترقی کا خواہاں ہوتا ہے اسے ایسے انسانوں کی ضرورت ہوتی ہے جو دوسرے کے سکون وآرام کو اپنے سکون پر ترجیح دیں اور اس جدوجہد میں کبھی شکوہ نہ کریں بلکہ انہیں اس بات کی خوشی ہو کہ وہ دوسروں کے کام آرہے ہیں۔ صحت مند معاشرہ ایسے انسانوں کی کوششوں سے معرض وجود میں آتا ہے جو لینے کی بجائے دینا جانتے ہوں جو فرض کی ادائیگی کو طلب حق پہ مقدم رکھتے ہوں جنہیں

مفاد ملت میں دیس کے بجائے غربت گوارا ہو، جو ضرورت کے موقع پر اپنا مال، اسباب بطیبِ خاطر نچھاور کر سکتے ہوں اور جو ملک وملت کے عمومی مفاد پہ ذاتی مصلحت کو قربان کرنے پر ہر وقت آمادہ رہتے ہوں۔

ایسے انسان کہاں پائے جاتے ہیں؟ کس مدرسہ فکر اور کس تربیتی ادارہ سے ایسے لوگ تیار ہو کر نکلتے ہیں۔ بخدا وہ اپنی نوعیت کا ایک ہی مدرسہ ہے جسے ہم مدرسہ ایمان سے تعبیر کرتے ہیں، اسی مدرسہ کے فارغ اپنی خواہشات نفس اور اپنی احتیاجات کو نظر انداز کر سکتے ہیں۔ اپنی بھوک کو مٹانے کیلئے طعام کی معمولی مقدار اور اپنے ستر کو ڈھانکنے کیلئے بقدر ضرورت لباس پر قناعت کر لیتے ہیں یہ ایمان ہی کی تربیت ہے جو انہیں مال قلیل پہ راضی کر دیتی ہے اور اس مال کے بذل وانفاق کا بھی حوصلہ عطا کرتی ہے وہ بلند اور پاکیزہ مقاصد کیلئے گھر بار چھوڑ دیتے ہیں اپنی جانیں ہتھیلی پر رکھ لیتے ہیں اور مطمئن ضمیر کے ساتھ مصائب کا مقابلہ کرتے ہیں اس لئے کہ وہ پختہ یقین رکھتے ہیں کہ اس زندگی کے بعد جنت ان کے انتظار میں ہے "ورضوان من اللہ اکبر۔"

مومن اللہ کی راہ میں کسی طرح کی سعی وجہد...... کیا مادی واخلاقی اور کیا نفسی وبدنی...... سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ کیونکہ از قسم ایثار اس کا ہر چھوٹا بڑا عمل اللہ کے ہاں اس کے حساب میں جمع ہوتا رہتا ہے۔ کوئی ذرہ برابر نیکی بھی ضائع نہیں ہوتی۔ صداقت کی راہ میں اٹھنے والا ہر قدم اور بھلائی کی خاطر خرچ کی جانے والی پائی پائی حتیٰ کہ بھوک پیاس اور تکان کا ادنیٰ احساس بھی اسے اجر عظیم کا سزاوار بنا دیتا ہے۔

مَا كَانَ لِاَهْلِ الْمَدِيْنَةِ وَمَنْ حَوْلَهُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ اَنْ يَّتَخَلَّفُوْا عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ وَلَا يَرْغَبُوْا بِاَنْفُسِهِمْ عَنْ نَّفْسِهٖ ط ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ لَا يُصِيْبُهُمْ ظَمَاٌ وَّلَا نَصَبٌ وَّلَا مَخْمَصَةٌ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَطَـُٔوْنَ مَوْطِئًا يَّغِيْظُ الْكُفَّارَ وَلَا يَنَالُوْنَ مِنْ عَدُوٍّ نَّيْلًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ بِهٖ عَمَلٌ صَالِحٌ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ. وَلَا يُنْفِقُوْنَ نَفَقَةً صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً وَّلَا يَقْطَعُوْنَ وَادِيًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ. (التوبہ: ۱۲۰، ۱۲۱)

"ایسا کبھی نہ ہوگا کہ اللہ کی راہ میں بھوک پیاس اور جسمانی مشقت کی کوئی تکلیف وہ جھیلیں اور منکرین حق

کو جو راہ ناگوار ہے اس پر کوئی قدم وہ اٹھائیں اور کسی دشمن سے عداوت حق کا کوئی انتقام وہ لیں اور اس کے بدلے ان کے حق میں ایک عمل صالح نہ لکھا جائے یقیناً اللہ کے ہاں محسنوں کا حق الخدمت مارا نہیں جاتا اسی طرح یہ بھی کبھی نہ ہوگا کہ (راہ خدا) میں تھوڑا یا بہت کوئی خرچ وہ اٹھائیں اور (سعی جہاد میں) کوئی وادی وہ پار کریں اور ان کے حساب میں اسے نہ لکھا جائے تا کہ اللہ ان کے اس اچھے کارنامے کا صلہ انہیں عطا کرے۔"

اس کے بعد یہ بات قابل تعجب نہیں رہتی اگر ہم دیکھیں کہ مسلمانوں نے اپنے دور شباب وعروج میں قربانی وجہاد اور بذل وانفاق کے کیسے کیسے عظیم الشان ریکارڈ قائم کئے ہیں؟

اہل ایمان کے بذل وایثار اور سعی وجہاد کے نمونے:۔

حضرت ابوطلحہؓ انصاری سورہ توبہ کی تلاوت کے دوران جب اس آیت پر پہنچے:

"اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا وَّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ".

تو اپنے جی میں کہنے لگے خفافاً وثقالاً یعنی راہ میں جہاد کیلئے ہر حال میں نکلو جوانی اور بڑھاپے میں بھی فارغ البالی اور تنگ دستی میں بھی۔ اللہ نے تو کسی کا عذر نہیں سنا۔ چنانچہ اپنے بیٹوں سے کہنے لگے میرے لئے سامان جہاد تیار کرو۔ انہوں نے کہا: ابا جان اللہ آپ پر رحم فرمائے آپ نبی اکرمؐ کے ساتھ جہاد کرتے رہے تا آنکہ آپ کا وصال ہو گیا۔ پھر حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ مل کر جہاد کرتے رہے حتیٰ کہ وہ بھی وفات پا گئے بعد ازاں حضرت عمرؓ کے دوش بدوش آپ ان کے انتقال تک راہ خدا میں لڑتے رہے تو ساری عمر آپ نے جہاد میں بسر کی ہے اب آپ رہنے دیں ہم آپ کی جگہ پر جہاد کریں گے مگر حضرت ابوطلحہؓ نے فرمایا نہیں میرے لئے سامان جہاد تیار کرو چنانچہ انہوں نے سامان حرب تیار کر دیا اور جناب ابوطلحہؓ ایک بحری مہم پر فوج کیساتھ روانہ ہو گئے۔ سمندر میں آپ نے بحالت جہاد وفات پائی اور ایک جزیرے میں دفن کئے گئے۔

حضرت سعید بن المسیبؒ جہاد کیلئے اس حالت میں نکلے کہ ان کی ایک آنکھ کی بصارت زائل ہو چکی تھی ان سے کہا گیا کہ آپ چونکہ علیل ہیں اس لئے گھر پر ہی رہیں مگر انہوں نے مندرجہ بالا آیت کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تو ہر حال میں شریک جہاد ہونے کا حکم صادر فرمایا ہے اگر میں حرب وقتال میں کوئی زیادہ کام نہ کر سکا تو میری موجودگی سے مسلمانوں کی فوج کی

تعداد تو ضرور زیادہ نظر آئے گی اور میں ساز و سامان کی حفاظت میں معاونت کر سکوں گا۔

روایات میں آتا ہے کہ ایک غزوہ میں باپ اور بیٹا دونوں بیک وقت شرکت کیلئے انتہائی آرزو مند نظر آتے تھے مگر صورت یہ تھی کہ ان دونوں میں سے ایک ہی کو شرکت کی اجازت مل سکتی تھی چنانچہ اس امر کے فیصلے کیلئے قرعہ ڈالا گیا، اور وہ بیٹے کا نام نکل آیا۔ باپ نے بیٹے سے حسرت بھرے انداز میں فرمایا بیٹا مجھے اپنے آپ پر فوقیت دو کیونکہ میں تمہارا باپ ہوں بیٹے نے کہا اے ابا...... جنت کا معاملہ ہے خدا کی قسم اگر اس کے علاوہ کوئی دوسرا معاملہ ہوتا تو میں یقیناً آپ کو ترجیح دیتا۔

حضرت عمروؓ بن الجموح انصاری بہت زیادہ لنگڑا کر چلتے تھے ان کے چار جوان بیٹے تھے جو رسول اللہؐ کے ساتھ جہاد میں حصہ لیتے تھے۔ غزوہ احد کے موقع پر انہوں نے اپنے بیٹوں سے کہا اب کے میرے لئے بھی سامان جہاد تیار کرو بیٹوں نے عرض کی اللہ تعالیٰ نے آپ کو معذور قرار دیا ہے لہٰذا آپ گھر پر ہی تشریف رکھیں۔ جہاد کیلئے ہم آپ کی طرف سے کافی ہیں جب بات بنتی نظر نہ آئی تو حضرت عمروؓ رسول اللہؐ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ بیٹے مجھے جہاد میں حصہ لینے سے منع کرتے ہیں مگر میں بخدا شہید ہو جاؤں گا اور اسی لاٹھی کے سہارے چلتا ہوا جنت میں پہنچوں گا رسولؐ پاک نے یہ سن کر فرمایا: لیکن آپ پر تو جہاد فرض ہی نہیں پھر آپؐ ان کے بیٹوں سے مخاطب ہوئے۔ اگر یہ جہاد میں شرکت کریں تو آپ کو اس پر کیا اعتراض ہے ہوسکتا ہے اللہ تعالیٰ انہیں شہادت کی نعمت سے سرفراز فرما دے۔ اس کے بعد حضرت عمروؓ بن الجموح نے غزوہ میں شرکت کی اور شہادت پائی انہیں کے بارے میں آپؐ نے انصار سے فرمایا تھا: اے گروہ انصار آپ میں ایسے افراد بھی موجود ہیں جو اللہ کی قسم کھا کر کسی کام کا عزم کریں تو اللہ تعالیٰ ان کی قسم کو پورا کر دیتا ہے۔ عمروؓ بن الجموح ان میں سے ایک ہیں۔

اور یہ حضرت مصعبؓ بن عمیر ہیں خوشحال ترین والدین کے بیٹے ناز و نعمت میں پلے ہوئے ماں باپ ان سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ انہیں بہترین کھانا کھلاتے، عمدہ لباس پہناتے مکہ کی جس گلی سے گزر جاتے فضا معطر ہو جاتی۔ یہی وہ ناز پروردہ نوجوان تھے جنہوں نے دار ارقم میں رسول اللہؐ کے دست حق پرست پر اسلام قبول کیا اور مصائب و آلام سے دوچار ہو گئے۔ والدین

اور اعزہ و اقارب نے انہیں پکڑ کر قید کر لیا مارا پیٹا گھر بار چھوڑنے پر مجبور ہو گئے ظالموں کے ظلم سے تنگ آ کر حبشہ کی طرف ہجرت کی پھر مدینہ کا رخ کیا اور بہت کچھ تنگی کی زندگی بسر کرتے رہے غزوہ احد میں شرکت کی اور شہادت کی دولت سے ہمکنار ہوئے بے سروسامانی اور کسمپرسی کا یہ عالم تھا کہ کفن کیلئے دو گز کپڑا میسر نہیں آ رہا تھا ایک ناتمام سی چادر تھی جس سے سر ڈھانپتے تو پاؤں ننگے ہو جاتے اور پاؤں ڈھانپنے کی کوشش کی جاتی تو سر کھلا رہ جاتا۔ نبی اکرمؐ کے سامنے حضرت مصعبؓ کی لاش کا یہ منظر آیا تو آپؐ بے اختیار رو دیئے اشکبار آنکھوں کے ساتھ آپ نے فرمایا: اے معصب میں نے تمہیں مکہ میں دیکھا تھا جب تم سے زیادہ ثمین در قیق لباس کسی کا نہ ہوتا تھا جب تمہارے سر کے کے بال عطر میں بسے ہوئے ایک شان حسن و جمال لئے ہوئے ہوتے تھے مگر اب تم ایک کھردری چادر کے نیچے پراگندہ بال پڑے ہو پھر آپؐ نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ج فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ صلے وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا۔

"ایمان لانے والوں میں ایسے لوگ موجود ہیں جنہوں نے اللہ سے کئے ہوئے عہد کو سچا کر دکھایا ہے ان میں سے کوئی اپنی نذر پوری کر چکا اور کوئی وقت آنے کا منتظر ہے انہوں نے اپنے رویے میں کوئی تبدیلی نہیں کی"۔

غور فرمائیے عیش و عشرت کی وہ زندگی تج کر ان پر صعوبت حالات کو قبول کر لینا کتنا بڑا ایثار تھا کتنی عظیم الشان قربانی تھی اسلام کے اولین داعی اگر ایسی قربانیاں دینے سے گریز کرتے تو حق و صداقت کی آواز چار دانگ عالم میں کبھی نہ پھیلتی اور اجتماع و معاشرہ کی فلاح و بہبود کیلئے اہل حق کو ایسی قربانیاں دینے کے قابل کس چیز نے بنایا تھا؟ ایمان اور صرف ایمان نے اس کے بعد بذل و انفاق مال کا ایک واقعہ سنیے۔

حضرت زید بن اسلم روایت کرتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی "مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا" تو حضرت ابو الدحداحؓ نے عرض کی: یا رسول اللہؐ میرے ماں باپ آپ پر قربان اللہ تعالیٰ ہم سے قرض مانگتا ہیں حالاں کہ وہ ذات قرض سے بے نیاز ہے آپؐ نے فرمایا ہاں اللہ تعالیٰ ہی قرض مانگتا ہیں تا کہ اس کے بدلے میں وہ تمہیں جنت میں داخل کر دے۔ انہوں

نے عرض کی تو میں اپنے پروردگار کو قرض دیتا ہوں کیا وہ مجھے اور میری بچی وحداحہ کو دخول جنت کی ضمانت دیتا ہے؟ آپؐ نے فرمایا ہاں! حضرت ابوالدحداح نے کہا...... تو لائیے اپنا دست مبارک آگے کیجئے نبی اکرمؐ نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا تو پکڑ کر کہنے لگے: دو باغ میری ملکیت ہیں ایک مدینہ کے زیریں علاقہ میں اور دوسرا بالائی حصے میں ان دو باغوں کے علاوہ بخدا اور کوئی چیز میرے پاس نہیں میں یہ دونوں باغ اللہ کو قرض دیتا ہوں۔ رسول اللہؐ نے فرمایا: ان میں سے ایک راہ خدا میں دے دو اور دوسرا اپنی اور اپنے اہل وعیال کی گزر اوقات کیلئے رکھ لو۔ اس پر حضرت ابوالدؓ حداح نے کہا تو پھر یا رسولؐ اللہ ان میں سے جو بہتر ہے وہ اللہ کی راہ میں دیتا ہوں آپ گواہ رہیں۔ اس باغ میں چھ سو کھجور کے درخت ہیں۔" رسول پاکؐ نے فرمایا: اس بذل وانفاق کے بدلے میں اللہ تعالیٰ آپ کو جنت دے گا ابوالدحداح یہ کہہ کر چل دیئے۔ اور باغ میں پہنچے جہاں ام الدحداح اپنے بچوں کے ہمراہ کھجور کے درختوں میں گھوم پھر رہی تھیں۔ انہیں دیکھ کر حضرت ابوالدحداح پکار اٹھے۔

اقرضته الله على اعتمادى	بالطوع لا منٍّ ارتسداد
الارجاء انصعف نے المعاد	فارتحلى بالنفس والاولاد
والبرُّ لا شكَّ فغيُرزاد	قدمه المرُ الى المعاد

(ترجمہ) میں نے یہ باغ اللہ کو بطور قرض خوش دلی سے دے دیا ہے نہ کوئی احسان کیا ہے اور نہ واپس لینے کی خواہش رکھتا ہوں میں نے اس اعتماد اور اس امید کے ساتھ یہ قرض دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ آخرت میں مجھے اس سے کئی گنا زیادہ عطا کرے گا۔ لہٰذا تو بال بچوں کو لے کر اس باغ سے نکل جا اس میں کچھ شک نہیں کہ وہی نیکی بہترین زادراہ ہے۔ جسے آدمی آخرت میں اجر پانے کی غرض سے کرے۔

ام الدحداح یہ سنتے ہی خاوند کی تحسین وتبشیر کرتے ہوئے بچوں کو لے کر باغ سے نکل گئی اور بچوں کے جیب ودامن میں جو کھجوریں تھیں اور جوان کے منہ میں تھیں سب نکلوا کو وہیں ڈھیر کر دیں۔ تاریخ اسلام اس طرح کے نمونوں سے بھری پڑی ہے۔ سعی وجہد، قربانی وایثار اور بذل وانفاق کے عظیم نمونوں سے جو محض ایمان کی بدولت عالم وجود میں آتے ہیں۔

ایمان اور جذبہ رحمت:۔

ایمان کے زیر اثر جو اجتماعی اخلاق نشوونما پاتے ہیں ان میں سے ایک نمایاں اور ممتاز خلق رحمت اور کرم کا جذبہ ہے کسی کمزور کو دیکھ کر دل میں رقت کا پیدا ہو جانا۔ کسی کو غمگین وحزیں پا کر تڑپ اٹھنا کسی غریب ومسکین سے محبت وشفقت سے پیش آنا اور کسی پریشان حال کی طرف دست تعاون بڑھانا اسی جذبہ ترحم کی بدولت ممکن ہوتا ہے یہی جذبہ انسان کو ایذاء رسانی سے دور رکھتا ہے، جرم وگناہ سے نفرت دلاتا ہے اور اسے ایک مصدر خیر وصلاح اور مرکز امن وسلامتی بنا کر پیش کرتا ہے ایک مومن کے اندر خاص طور پر یہ جذبہ اس لئے ظہور ونفوذ کرتا ہے کہ اللہ پر ایمان لا کر وہ اخلاق اللہ سے متخلّق ہونا چاہتا ہے اور رحم، اخلاق اللہ میں سب سے نمایاں اور غالب خلق ہے اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے۔

وَرِحْمَتِیْ وَسِعَتْ کُلَّ شَیئٍ — اور میری رحمت ہر چیز پر حاوی ہے

قرآن حکیم میں اللہ کے رحمان ورحیم ہونے کا تذکرہ جگہ جگہ ملتا ہے۔ قرآن کی تو ایک سو تیرہ سورتوں کا آغاز ہی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے ہوتا ہے ان سورتوں میں اللہ کی رحمت کا بیان اس پر مستزاد ہے پھر ہر نمازی فرض رکعتوں میں ہی اللہ تبارک وتعالیٰ کے مذکورہ اسمائے حسنیٰ کو چونتیس مرتبہ زبان سے ادا کرتا ہے سنن ونوافل کی ادائیگی کی صورت میں یہ تعداد دگنی چوگنی ہو جاتی ہے ان کو بار بار زبان سے ادا کر کے امام غزالیؒ کی تصریح کے مطابق...... مومن کے اندر یہ صفت پیدا ہو جاتی ہے کہ ہر محتاج کی رفع احتیاج کیلئے مقدور بھر کوشش کرے۔ اپنے محلے یا شہر کے کسی غریب اور مسکین کو دیکھے تو اس کی غربت ومسکنت کو دور کئے بغیر نہ چھوڑے یا خود مال دے کر کرے یا کسی سے مال دلائے یا کسی کے پاس جا کر اس کیلئے سفارش کرے اور اگر کچھ بھی نہ کر سکتا ہو تو اللہ تعالیٰ سے دعا ہی کرے کہ باری تعالیٰ اپنے اس بندے کے حال پر رحم فرما۔ مقصود کلام یہ ہے کہ اللہ کی رحمت کے اس کثیر تذکرہ سے اللہ پر ایمان رکھنے والا ہر شخص بہت کچھ اخذ واستفادہ کرتا ہے اور آگے چل کر مخلوق خدا اس کے جذبات رحم وتلطف سے بیش از بیش فیضیاب ہوتی ہے۔

مَنْ لاَ یرحَمُ لاَ یُرحَمُ:۔

مومن جو اللہ کی رحمت کا ہمیشہ محتاج اور طلبگار رہتا ہے اور جس کی دُنیوی فوز و فلاح اور اخروی نجات و مغفرت کا تمام تر دار و مدار رحمت حق پر ہی ہے۔اس حقیقت پر ایمان رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کا سزاوار صرف وہی بندہ ہوتا ہے جو مخلوق خدا پر مہربان ہو رسول اللہ کا فرمان ہے۔

اِنّمایرحم اللہ من عبادہ الرحمآء

بے شک اللہ تعالیٰ رحیم و شفیق بندوں پر اپنی رحمت نازل فرماتا ہے۔

نیز یہ کہ:

ارحموامن فِی الارض یرحمکم من فی السمآءِ.

تم ساکنان ارض کے ساتھ رحمت کا برتاؤ کرو آسمان والاتم پر رحم کرے گا۔

ان تعلیمات کے پیش نظر مومن کا رحم و شفقت کا برتاؤ صرف انسانوں تک ہی محدود نہیں رہتا بلکہ حیوانات و نباتات سب اس کے جذبہ رحم سے فیضیاب ہوتے ہیں۔

حضرت عمرؓ نے ایک آدمی کو دیکھا کہ وہ اپنی بکری کو پاؤں سے پکڑ کر گھسیٹتے لیے جا رہا تھا تا کہ ذبح کرے۔آپ نے فرمایا

ویلک قدھاالی الموت قردا جَمیلاً۔

تم پر افسوس ہے اسے مذبح کی طرف لے جا رہے ہو تو بھلے طریقے سے لے جاؤ۔

فتح مصر کے دوران حضرت عمرؓ بن العاص کے خیمے پر ایک کبوتری نے آشیانہ بنالیا۔ آنجناب نے جب کوچ کا ارادہ کیا تو اس خیال سے کہ کبوتری کا گھونسلا نہ ٹوٹ جائے خیمہ کو طے کر کے ساتھ لے جانا مناسب نہ سمجھا اور اپنی جگہ پر ہی قائم رہنے دیا۔بعض ازاں اسی خیمہ کے اردگرد آبادی شروع ہوگئی اور ایک شہر تعمیر ہو گیا جس کا نام ''الفسطاط'' تھا۔

خلیفۂ راشد حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز نے بلاضرورت گھوڑوں کو ایڑ لگانے سے حکماً روک دیا تھا نیز آپ نے شاہراہوں کے ناظم کو لکھا کہ جانوروں کو بھاری بھر کم لگام نہ ڈالی جائے علاوہ ازیں چابک کے نچلے حصہ میں لوہا نہ لگایا جائے۔اسی طرح والی مصر کو آپ نے لکھا ''مجھے اطلاع ملی ہے کہ بار برداری کے اونٹوں پر ایک ایک ہزار رطل بوجھ لاد دیا جاتا ہے۔میرا یہ مکتوب موصول

ہوتے ہی آئندہ کیلئے کسی اونٹ پر چھ سو رطل سے زائد بار نہ لادا جائے۔

اور یہ حضرت ابوبکرؓ الصدیق ہیں۔جیش اسامہؓ کی روانگی کے وقت حضرت اسامہؓ کو نصیحت کرتے ہیں دیکھنا کسی عورت کو قتل نہ کرنا کسی بوڑھے اور بچے کو نہ مارنا کھجور کا درخت ہو یا کوئی اور پھل دار درخت اسے کاٹنے سے احتراز کرنا نیز اگر کچھ لوگ عبادت گاہوں میں مصروف عبادت پاؤ تو انہیں بھی کچھ نہ کہنا جب تک وہ تمہارے قتل کے درپے نہ ہوں۔''

اجتماعی زندگی میں مسلمانوں کی رحمدلی کے یہ نمونے ہیں جن کی تربیت اور نشوونما کا تمام تر سہرا ایمان کے سر ہے۔

اسلامی معاشرہ میں آثار رحمت وشفقت:۔

ایمان دلوں میں رحمت و مودت کا جو بیج بوتا ہے اس کے نتیجے میں اہل ایمان ایسے امور خیر انجام دیتے ہیں جو ان کی زندگی میں بھی خلق خدا کو نفع بخشتے ہیں اور ان کی موت کے بعد بھی فیض رسانی کا سلسلہ قائم رہتا ہے۔وہ ہسپتال اور شفاخانے تعمیر کرتے ہیں سکول اور کالج بناتے ہیں، دارالامان اور یتیم خانوں کی سرپرستی کرتے ہیں غریب، مسکین اور یتیم بچوں کی تعلیم کا بندوبست کرتے ہیں اور ان کی دیگر احتیاجات کو بھی پورا کرتے ہیں۔مساجد اور سرائیں تعمیر کراتے ہیں اور پل اور تالاب بنواتے ہیں۔اسی طرح بھوکوں کو کھانا کھلانا، پیاسوں کو پانی مہیا کرنا، ننگوں کو لباس پہنانا، بیماروں کا علاج کرانا، لاوارث میتوں کو سپرد خاک کرنا اور محروم لوگوں کی مالی اعانت کرنا بھی ان کے دل پسند مشاغل ہوتے ہیں۔بعض اہل ثروت مدارس و مساجد کے نام بڑی بڑی جاگیریں اور جائیدادیں وقف کر دیتے ہیں جو مدت مدید تک ان اداروں کیلئے مضبوط سہارا ثابت ہوتی ہیں۔یہ آثار رحمت اسلامی معاشرہ میں قدم قدم پر دکھائی دیتے ہیں۔

مادہ پرستوں کی قساوت قلبی:۔

خدا پرستوں کے جذبات رحم و تلطف کا حال آپ پڑھ چکے ہیں۔اب ایک نظر مادہ پرستوں کی درندگی و قساوت قلبی کا بھی جائزہ لیتے جائیے۔معروف صحافی علی امین لکھتا ہے لینن کی موت کے بعد اشتراکی پارٹی کی گورننگ باڈی نے بالاتفاق سٹالن کو سربراہ منتخب کیا اور سٹالن نے اس

گورننگ باڈی کے تمام ممبران کو قتل کروادیا اور لینن کے تمام وزراء کو بھی تہمت خیانت سے متہم کرتے ہوئے ہلاک کردیا۔ مزدور یونینین جو اسے مبارک باد دینے کیلئے جمع ہوئی تھیں ان کے اسی فیصد سیکرٹریوں کو تہ تیغ کردیا۔ 1936ء کی دستور کمیٹی کے 27 میں سے 15 ممبران کو مرواڈالا کیمونسٹ پارٹی کے ترپن میں سے تینتالیس سیکرٹریوں کو موت کی نیند سلادیا۔ سویٹ روس کی مجلس دفاع کے اسی میں سے ستر ممبران کو ہلاک کردیا۔ سرخ فوج کے پانچ میں سے تین مارشلوں کو قتل کر دیا 1936ء میں مجلس وزراء کے گیارہ میں سے نوارکان کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور سرخ فوج کے 60 فیصد کمانڈروں کو اور تیس ہزار سرکاری ملازمین کو ہلاک کردیا۔"

یہ قتل وغارت گری اشتراکی نظام کا جزولاینفک ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ روس کے کارفرما خدا اور اس کی تعلیمات کے منکر ہیں وہ تعلیمات جو انسان کو انسانیت کا درس دیتی ہیں اور اسے مکارم اخلاق سے آراستہ کرتی ہیں۔ ظلم وسفاکی کی ان مثالوں کو سامنے رکھتے ہوئے سیدنا عثمان بن عفانؓ کا جذبہ ترحم ملاحظہ فرمائیں سبائیوں نے جس وقت خلیفہ راشد کے مکان کا محاصرہ کیا تو آپ کے پاس بعض ایسے جاں نثار موجود تھے جو ان باغیوں کو تہ تیغ کردینے کا مصمم ارادہ رکھتے تھے مگر عثمانؓ نے یہ کہتے ہوئے ان کے ہاتھ روک دیئے کہ اگر ایک مرتبہ تلوار نیام سے باہر آگئی تو پھر خونریزی کا بند کرنا مشکل ہوگا۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے حضرت عثمانؓ کی زندگی کو خطرے میں گھرا ہوا دیکھ کر تلوار سونت لی اور سبائیوں پر حملہ کرنے کی غرض سے باہر نکلنے کی کوشش کی مگر حضرت عثمانؓ نے انہیں ایسا کرنے سے منع کیا اسی طرح زید بن ثابتؓ نے بھی انصار کی جمعیت کے ساتھ خلیفہ راشد کے حضور میں باغیوں کو تہس نہس کرنے کی پیشکش کی مگر انہوں نے اس مسلح سرکوبی کے عواقب کو سامنے رکھتے ہوئے صاف انکار کردیا۔

حضرت عامرؓ بن ربیعہ کا ارشاد ہے کہ وہ سبائیوں کی یلغار کے وقت حضرت عثمان کے پاس موجود تھے مگر انہوں نے ہمیں ان الفاظ کے ساتھ محاصرہ کرنے والوں پر حملہ کرنے سے منع فرمای۔

"یادرکھو کہ تم میں سے جو کوئی اس حقیقت کو جانتا ہے کہ اس پر میری اطاعت لازم ہے اسے

مسلمانوں کے خلاف اسلحہ اٹھانے سے اجتناب کرنا چاہیے۔"

حضرت عثمانؓ کو جب اپنے اس طرز عمل پر نظر ثانی کیلئے کہا گیا تو آپ نے ارشاد فرمایا:

"کسی مسلمان کا خون صرف تین صورتوں ہی میں مباح ہوسکتا ہے ایمان کے بعد کفر اختیار کرنے کی صورت میں۔ قتل ناحق اور شادی شدہ شخص کے زنا کرنے کی صورت میں۔"

پھر انہوں نے لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ بتاؤ کہ میں ان تینوں میں سے کس بنیاد پر تمہیں لوگوں کا خون بہانے کی اجازت دوں۔

ایمان کے محسوس نتائج:۔

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ دین وایمان مجرد عقائد کا نام ہے جو انسان کو زندگی کی حرکت اور حرارت سے محروم رکھتے ہیں اس کی خواہش ومحبت دنیا کو مٹا دیتے ہیں اور اس کے اندر عمل اور جدوجہد کیلئے کوئی رغبت باقی نہیں رہنے دیتے۔ ایمان کے بارے میں یہ مغالطہ جہالت کا پیدا کردہ ہے کیونکہ حقیقت ایمان محض ایک ذہنی تصدیق قلبی کا نام ہی نہیں بلکہ عمل اور جدوجہد سے بھی عبارت ہے عمل ایمان کا جزولاینفک ہے عمل دُنیوی کامیابی اور اخروی سعادت کی بنیاد ہے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَتِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ O فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ جَزَآءً بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۔

"اور یہ وہ جنت ہے جس کا وارث تمہیں بنایا گیا ہے اس لئے کہ تم عمل کرتے تھے۔ کسی جان کو معلوم نہیں، آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچانے والے جو ساز وسامان ان کے لئے پوشیدہ رکھے گئے ہیں یہ بدلہ ہے اس کا جو وہ عمل کرتے تھے"۔

یہ تو تھا اخروی سعادت کا عمل پر موقوف ہونا جہاں تک دُنیوی کامیابی کا تعلق ہے وہ بھی عمل ہی سے حاصل ہوتی ہے تعلیمات اسلام میں محنت مزدوری اور ہاتھ سے کام کرنے کی جو فضیلت بیان ہوئی ہے وہ کس چیز کی غماز ہے؟ تجارت اور کاروبار کے جو اصول وضع کیئے گئے ہیں اور شرکت ومضاربت اور لین دین کی جو صورتیں متعین کی گئی ہیں وہ آخر کن لوگوں کیلئے ہیں؟ کیا ہاتھ پہ ہاتھ دھر کر بیٹھ رہنے والوں کیلئے؟ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور جہاد وقتال یہ سب امور جو ایک

مسلمان کی دنیوی کامرانی کے ضامن ہیں کیا عمل کے بغیر انجام پا سکتے ہیں؟ حکومت وسلطنت کے فرائض، امن وامان کا قیام اعمال وولاۃ کا عزل ونصب قضاۃ کا تقرر اور پولیس اور فوج کی تشکیل یہ سارے کام عمل مسلسل ہی کا تو تقاضا کرتے ہیں۔ مقصود کلام یہ ہے کہ ایمان نہ صرف یہ کہ انسان کو ہر وقت چاق وچوبند اور مستعد رکھتا ہے بلکہ وہ اس کی سعی وعمل کو صحیح سمت میں لگا کر اسے عبادت کا درجہ دیتا ہے جس سے آدمی نہ جی چراتا ہے اور نہ تھکتا ہے اور عبادت کا پاکیزہ محرک اسے ہر آن ایک ولولۂ تازہ سے سرشار رکھتا ہے۔

مومن، خوف خدا کے زیر اثر کام کو اچھی طرح انجام دیتا ہے:۔

مومن جس کام میں بھی ہاتھ ڈالے اسے بے دلی سے کبھی نہیں کرتا بلکہ اس کوشش میں رہتا ہے کہ ممکن حد تک مفوضہ ذمہ داری سے بطریق احسن عہدہ برآ ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عام کارندے تو اپنے آپ کو صرف اپنے مالک کے سامنے ہی جوابدہ سمجھتے ہیں، مگر مومن اپنے مالک کے ساتھ ساتھ اپنے آقائے حقیقی (اللہ تعالیٰ) کے روبرو بھی خود کو مواخذہ ومحاسبہ کیلئے تیار رکھتا ہے بنابریں وہ کسی قیمت پر بھی خیانت وبدعہدی کا مرتکب نہیں ہوتا اور نہ ادائے فرض میں دانستہ کوئی کوتاہی کرتا ہے رسول اللہؐ نے فرمایا:

اِن اللہ یحب اذاعمل احد کم عملان.

تحقیق اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے کہ تم میں سے جب کوئی شخص کسی کام کو کرے تو خوب اچھی طرح کرے۔

ادائے فرض میں استقامت:۔

لوگ کھیل تماشوں میں اپنے اوقات کا بیشتر حصہ ضائع کر دیتے ہیں۔ حرام اور ناجائز امور میں منہمک رہتے ہیں۔ شراب پیتے ہیں اور رات گئے تک گپیں ہانکتے رہتے ہیں غرض خواہشات نفس کے ہاتھ میں اپنی زندگی کی باگ ڈور دے دینے سے لوگ ادائے فرض میں کبھی استقامت نہیں دکھاتے اور نہیں دکھا سکتے کیونکہ وہ اپنی جسمانی وعقلی قوتوں کو بے جا استعمال کر کے اس قابل نہیں رہتے کہ اپنے روزمرہ کے مشاغل حسن وخوبی سے انجام دے سکیں ایک مثال عرض ہے اخبارات میں آچکا ہے کہ امریکہ میں سات کروڑ بیس لاکھ افراد نشہ کرتے ہیں جن میں سے دو کروڑ

اپنے فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی کے مرتکب ہو کر ہر سال حکومت کو کھربوں ڈالر کا نقصان پہنچاتے ہیں۔ یہ نتیجہ صرف شراب کی لت کا ہے ایسے ہی دوسرے بے ہودہ مشاغل میں انہماک بحیثیت مجموعی قومی ومعاشرتی سطح پر جس نقصان عظیم کا موجب بن سکتا ہے اس کا اندازہ مشکل نہیں۔

اس کے برعکس مومن اپنے اوقات کی قدر وقیمت کا خوب احساس رکھتا ہے قیامت کے روز اللہ تعالیٰ جہاں اس سے اور سوالات کرے گا وہاں ایک سوال یہ بھی ہوگا کہ تو نے اپنی عمر کن کاموں میں کھپائی اور اپنا عہد شباب کیسے گزارا؟ بنابریں ایماندار اپنے وقت کو ضائع کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ اس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ آج کا کام آج ہی ختم کر لے نیز آج کی کارکردگی گزرنے والے کل سے بہتر ہو۔ علاوہ ازیں وہ صرف ان کاموں میں ہی دلچسپی نہیں لیتا جن کا فائدہ جلد حاصل ہوتا نظر آتا ہو بلکہ وہ ایسے امور خیر بھی انجام دیتا ہے جن کی نفع بخشی وفیض رسانی کا سلسلہ اس کی موت کے بعد بھی جاری رہتا ہے حضرت ابوالدرداءؓ رسول پاکؐ کے مشہور صحابی عمر کے آخری حصے میں اخروٹ کا ایک درخت لگا رہے تھے ایک آدمی نے دیکھا تو کہنے لگا آپ یہ پودا لگا رہے ہیں درآنحالیکہ آپ بہت بوڑھے ہیں اور یہ درخت تو اتنے اور اتنے سالوں کے بعد جا کر پھل دیا کرتا ہے۔ حضرت ابوالدرداءؓ نے فرمایا میرا کیا نقصان ہے اگر اس کا ثواب مجھے مل جائے اور اس کا پھل میرے علاوہ کسی اور کو حاصل ہو۔

مومن خدا کی زمین کو آباد کرتا ہے:۔

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ مومن تکیئے کے درویش یا غاروں اور کھوہوں میں بیٹھ رہنے والے لوگ ہوتے ہیں جنہیں معاملات زندگی سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ حالانکہ یہ نرا مفروضہ ہے اور بالکل غلط ہے اگرچہ بعض مذاہب میں ہفتہ کے سات دنوں میں سے ایک دن کو عبادت کیلئے مخصوص کر لیا گیا ہے لیکن اسلام کسی ایسی تخصیص کا قائل نہیں جمعہ کا دن جس کو بلحاظ عبادت اسلام میں خاص اہمیت حاصل ہے...... بھی سارے کا سارا عبادت کیلئے وقف نہیں کیا گیا بلکہ نماز جمعہ ادا کرنے کے بعد حکم ہے۔

فَانْتَشِرُوْا فِی الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰہِ۔

زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو۔

پس معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ اپنی زمین کو آباد اور خوشحال دیکھنا چاہتا ہے اور نہ ہی پسند کرتا ہے کہ لوگ گیان دھیان میں کچھ اس طرح مستغرق ہو جائیں کہ انہیں دنیا و مافیہا سے کوئی واسطہ نہ رہے اور ہاتھ توڑ کر بیٹھے رہیں بیان کیا جاتا ہے کہ ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ کچھ لوگ نماز جمعہ سے فارغ ہونے کے بعد مسجد کے ایک کونے میں سر چھپائے بیٹھے ہیں آپ نے پوچھا تم کون ہو انہوں نے جواب دیا۔

نَحن المتو کلون علی اللّٰہ ہم اللہ پر توکل کرنے والے لوگ ہیں

حضرت عمرؓ نے اپنے مشہور درہ کو حرکت دی اور انہیں ڈانٹتے ہوئے فرمایا! خبردار اگر تم میں سے کسی نے طلب رزق سے کنارہ کشی اختیار کی اور اللہ سے دعا کرنے لگا کہ یا اللہ مجھے بیٹھے بٹھائے ہی رزق دے حالانکہ وہ جانتا ہے کہ آسمان سے سونے اور چاندی کی بارش نہیں ہوا کرتی۔ کیا تمہیں اللہ تعالیٰ کا یہ حکم یاد نہیں کہ جب نماز سے فارغ ہو جاؤ تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو۔؟؟

عبادت کا یہ مطلب نہیں کہ آدمی سعی و عمل اور جد و جہد سے دستکش ہو جائے اور نہ ایمان بالآخرۃ کا ہی یہ مفہوم ہے کہ دنیا اور اس کے معاملات سے کوئی سروکار نہ رکھا جائے۔ نبیؐ کے صحابہ زراعت پیشہ تھے، تاجر تھے، کاریگر اور ہنر مند تھے ان میں سے کسی کو بھی ہم توکل و قناعت کے اس مفہوم پر عمل پیرا نہیں دیکھتے کہ کام کرنے کی ضرورت نہیں۔ اللہ میاں خود بخود دیں گے۔ انہوں نے تو رسولؐ کی اس تعلیم کو پلے باندھ رکھا تھا کہ اگر قیامت برپا ہو جائے اور تم میں سے کسی کے ہاتھ میں کھجور کی شاخ ہو تو اسے اگر زمین میں گاڑ سکو تو ضرور گاڑ دو غور فرمایئے رسول پاکؐ نے کس کس طرح اپنے صحابہ میں زندگی کی حرارت اور حرکت پیدا کی اور حرکت بھی وہ جس سے بظاہر فوری انتفاع کی کوئی امید نہ ہو۔

توکل کا صحیح مفہوم:۔

بعض لوگ توکل کا مطلب ترک اسباب لیتے ہیں جو کسی طرح بھی درست نہیں توکل کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ آدمی اپنی سی پوری کوشش کرے اور ممکن حد تک ذرائع، وسائل کو استعمال کرنے کے بعد نتائج کیلئے اللہ تعالیٰ پر انحصار کرے اور یہ نہ سمجھے کہ میری کوشش ہی مطلوبہ نتائج کی ضامن

ہے۔ جیسا کہ اعرابی والے واقعہ سے سمجھ میں آتا ہے اس نے مسجد کے دروازہ پر اپنا اونٹ کھلا چھوڑ دیا اور یہ گمان کیا کہ یہ توکل ہے۔ اس پر رسول مقبولؐ نے فرمایا۔ ''اِعقلھا وتَوَکّل'' اسے رسی سے باندھ پھر اللہ پر توکل کر بعض لوگ اس حدیث سے ترک اسباب کا نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ اگر تم اللہ پر توکل کرو جیسا کہ توکل کا حق ہے تو اللہ تمہیں بھی اسی طرح رزق دے جس طرح پرندوں کر دیتا ہے۔ وہ صبحدم خالی پیٹ اپنے آشیانوں سے نکل جاتے ہیں اور شام کو پیٹ بھر کر واپس آتے ہیں لیکن اگر معمولی غور و فکر سے کام لیا جائے تو صورت اس کے برعکس نظر آتی ہے۔ پرندے آشیانوں سے نکلتے ہیں تو پھر ان کی شکم سیری کا بندوبست ہوتا ہے۔ آشیانوں میں بیٹھے بیٹھے تو ان کے پیٹ نہیں بھر جاتے ترک اسباب کا اثبات اس حدیث سے اس صورت میں ہو سکتا تھا اگر رسول پاکؐ یہ فرماتے کہ پرندے صبح دم خالی پیٹ اپنے آشیانوں میں ہی بیٹھے رہتے ہیں اور سیر ہو جاتے ہیں۔

*****

ایمان ایک عظیم قوت

دنیا میں انسان کے پیش نظر بیسیوں مقاصد ہوتے ہیں جنہیں حاصل کرنے کیلئے اسے متواتر جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔اس تگ ودو اور کشمکش کے دوران اسے قدم قدم پر اپنی کمزوریوں کا احساس ہوتا ہے جو اسے کسی بڑی قوت کا سہارا لینے پر مجبور کرتا ہے۔ایسی قوت جو ہر مشکل مرحلہ پر اس کی دستگیری کرے اس کی راہ کے خطرات کو دور کر دے۔اور سفر زندگی کی گہری تاریکیوں میں تا حد نظر اجالا کر دے۔

وہ قوت بس ایک ہی قوت ہے۔عقیدہ وایمان کی قوت۔اس قوت کی بدولت بندہ مومن اتنا طاقتور ہو جاتا ہے کہ کسی چیز کو خاطر میں نہیں لاتا۔اللہ کے فضل کی اسے امید ہوتی ہے اللہ کے عذاب سے وہ ڈرتا ہے وہ نہتا ہو کر بھی بڑا قوی ہوتا ہے کیونکہ اللہ اس کے ساتھ ہوتا ہے۔وہ مفلس وتہی دست ہونے کے باوجود غنی ہوتا ہے۔تن تنہا رہ کر بھی اپنے آپ کو غالب وتوانا محسوس کرتا ہے اور جب سفینہ حیات کسی گرداب میں پھنس جاتا ہے تو وہ کسی اضطراب کا شکار نہیں ہوتا۔بلکہ پہاڑ کی سی مضبوطی واستقامت کا مظاہرہ کرتا ہے نبی اکرمؐ نے ایمان باللہ کی حیرت انگیز طاقت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

لو عرفتم اللّٰہ حق معرفته لزالت بد عائکم الجبال.

اگر تم اللہ کی معرفت کماحقہ حاصل کرلو تو تمہاری دعا سے پہاڑ ٹل جائیں۔

فرد کے اندر قوت کا یہ خزانہ دراصل معاشرہ کی قوت کا مصدر و ماخذ ہے اور وہ معاشرہ کتنا سعادت مند ہے جس کے افراد قوت ورسوخ کے اس درجہ پر فائز ہوں،اس کے برعکس قوت ایمان سے محروم کمزور دوں ہمت اور درماندہ لوگوں کا معاشرہ کتنا شقی و بدبخت معاشرہ ہے جس میں کوئی اپنے دوست کی مدد نہیں کرتا اور نہ اپنے دشمن کو ڈرا دھمکا سکتا ہے۔

مومن کے نزدیک قوت کے مصادر:۔

ا۔ الایمان باللہ۔" اللہ قوی وقدیر ہے اور علی وکبیر بھی،جو اس پر ایمان لائے،اس پر بھروسہ کرے اور اس کے حاضر وناظر ہونے کا پختہ اعتقاد رکھے اللہ کبھی اسے بے یار و مددگار نہیں چھوڑتا۔

وکان حقا علینا نصر المومنین ان ینصر کم اللّٰہ فلا غالب لکم

اور ایمانداروں کی مدد کرنا ہمارا فرض ہے اور جس کی اللہ مدد کرے اس پر کوئی غالب نہیں آسکتا

۲۔ الایمان بالحق" مومن کی قوت کا دوسرا بڑا ماخذ اس کا حق وصداقت پر ایمان ہے وہ خواہش نفس کے زیر اثر کوئی کام نہیں کرتا۔نہ ذاتی منفعت نہ جاہلی عصبیت اور نہ ظلم وزیادتی اس کے اعمال کی محرک ہوتی ہے بلکہ وہ اس حق کیلئے سب کچھ کرتا ہے جس پر سمٰوات والارض قائم ہیں اور جہاں حق ہوگا وہاں کوئی دوسری چیز ٹھہر نہیں سکتی۔

وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا.

قادسیہ کی لڑائی میں حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کے سفیر ربعیؓ بن عامر جب ایرانیوں کے سپہ سالار رستم کے پاس گئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ اس کے خدم وحشم اور اس کے لشکری سونے چاندی میں لدے پھندے اس کے اردگرد دست بستہ کھڑے ہیں۔مگر جناب ربعی بن عامر کسی چیز کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے آگے بڑھتے گئے اور اپنے کوتاہ قامت گھوڑے اپنی موٹی جھوٹی ڈھال اور اپنے معمولی لباس کے ساتھ رستم کے پاس جا پہنچے اس نے سوال کیا تم کون ہو؟ اللہ کے اس بندے نے پوری قوت سے کہا: ہم ایک ایسی قوم ہیں جسے اللہ نے اس مقصد کیلئے معبوث فرمایا ہے کہ ہم اس کی مخلوق کو بندوں کی غلامی سے نکال کر اللہ وحدہ لاشریک کی غلامی میں دیدیں اور دنیا کی تنگی سے نکال کر کشائش سے ہمکنار کریں اور باطل ادیان اور طاغوتی قوتوں کے ظلم وجور سے بچا کر اسلام کے سایہ رحمت میں لے آئیں،کشور کشائی ہمارا مقصد نہیں......ربعیؓ بن عامر کے اندر یہ کیا چیز بول رہی تھی۔رستم ایران کے سامنے ان کا یہ بے باکانہ طرز تخاطب کس بنا پر تھا؟ صرف اس بنا پر کہ وہ حق صداقت کے نمائندہ اور علمبردار تھے۔اور قوت حق وصداقت نے ان کے اندر یہ شجاعت اور بیباکی پیدا کر دی تھی۔

۳۔ ایمان بالخلود" انسان کے اندر جو مختلف چیزیں جبن وضعف اور انحطاط پیدا کر دیتی ہیں ان میں سے ایک اس کا یہ احساس بھی ہے کہ وہ فانی مخلوق ہے کہیں فنا نہ ہو جائے اس کا کوئی اقدام اس کی موت کا پیغام نہ بن جائے۔لیکن مومن زندگی کو اسی دنیا کی زندگی تک محدود نہیں سمجھتا بلکہ وہ ان روئے ایمان ویقین اس کا سلسلہ ناقابل بیان حد تک پھیلا ہوا دیکھتا ہے موت اس کی

نظر میں ایک پردہ ہے۔ جس کے پیچھے زندگی اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہے یہی وجہ ہے کہ موت کا احساس اسے بزدل نہیں بناتا اس کے برعکس وہ آگے بڑھ کر موت کو گلے لگا لیتا ہے۔ کیونکہ موت آ جانے سے وہ ابدی زندگی اور اس کی نعمتوں کو پالیتا ہے۔ حضرت عمیر بن الحمام انصاری غزوہ بدر میں شریک ہوئے کسی موقع پر ایک طرف کھڑے کھجوریں کھا رہے تھے کہ رسول اللہ کی زبان مبارک سے یہ کلمات سنے۔

والذی نفسی بیدہ' مامن رجل یقاتلهم الیوم فیقتل صابرا محتسبا مقبلا غیر مدبرا الاادخله الله الجنة.

اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے جو آدمی بھی آج ان سے مشرکین لڑے اور نتیجۃً قتل ہو جائے اس حال میں کہ وہ صابر ہو۔ ثواب کی نیت سے لڑائی میں حصہ لے رہا ہو پیچھے ہٹنے کے بجائے آگے بڑھنے والا ہو۔ اللہ اسے جنت میں داخل کر دے گا۔

اور حضرت عمیر کے منہ سے بے اختیار نکلا بَخٍ بَخٍ (کلمہ تعجب ہے) رسول پاکؐ نے فرمایا: اے ابن الحمام کس بات پر تعجب کرتے ہو؟ انہوں نے عرض کی تو کیا یا رسولؐ اللہ میرے اور جنت کے درمیان صرف موت ہی حائل ہے۔ یعنی آگے بڑھ کر لڑائی کروں اور مارا جاؤں۔ رسول پاکؐ نے فرمایا تو اور کیا۔ یہ سنتے ہی حضرت عمیرؓ نے ہاتھ میں جو کھجوریں تھیں پھینک دیں اور کہنے لگے کھجوریں ختم ہونے کا انتظار کون کرے۔ اسی وقت دشمن کی صفوں میں گھس گئے اور بے جگری سے لڑنے لگے۔ ان کی زبان پر یہ رجز تھا۔

رکضاً الی اللہ بغیر زادٍ — الا التقی وعمل المعادٍ
والصبر فی اللہ علی الجہادٍ — وکل زادٍ عرضۃ النفادٍ
غیر التقی والبر والرشادٍ

''اللہ کی جانب بغیر زادِ راہ کے رواں دواں ہوں۔ اپنا زادِ راہ تقویٰ اور آخرت میں اجر پانے کی نیت سے کیا جانے والا عمل ہے۔ راہ خدا میں جہاد کیلئے اپنے آپ کو وقف کر چکا ہوں اور تقویٰ نیکی اور بھلائی کے علاوہ ہر دوسرا زادِ راہ ختم ہونے والا ہے''۔

۴۔ الایمان بالقدر...... چوتھی چیز جو ایک مومن کیلئے قوت کا باعث ہے وہ اس کا تقدیر پر

محکم ایمان ہے وہ جانتا ہے کہ جو مصیبت بھی پہنچتی ہے اللہ کے اذن سے پہنچتی ہے تمام انسان، جن اور دوسری جملہ مخلوقات مل کر بھی اگر کسی کو کوئی فائدہ پہنچانا چاہیں تو نہیں پہنچا سکتیں الّا یہ کہ اللہ کی مشیت بھی یہی ہو:

قُلْ لن یُّصِیبنا اِلّاما کَتَبَ اللّٰهُ لَنا هُوَ مَوْلَانا وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَو كَّلِ الْمُؤمِنُوْن.

مومن اس بات کا پختہ یقین رکھتا ہے کہ اس کے رزق کی تقسیم ہو چکی ہے اور اس کی موت کا وقت مقرر ہو چکا ہے۔

اس عقیدہ کے نتیجے میں اس کے اندر ایسی زبردست قوت پیدا ہو جاتی ہے جو تمام خطرات و وساوس کا قلع قمع کر دیتی ہے اور وہ بے خوف ہو کر میدان جہاد میں کود جاتا ہے کوئی پوچھے کہ بیوی بچوں کا کیا کر چلے ہو تو اس کا جواب یہ ہوتا ہے۔

علینا الن نطیعَه' تعالیٰ کما امرنا وعلیه ان یرزقنا کما وعدنا.

ہمارا فرض ہے کہ ہر حال میں اللہ کے حکم کی اطاعت کریں جیسا کہ اس نے ہمیں حکم دیا ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ ہمیں رزق دے جس کا اس نے ہمارے ساتھ وعدہ کر رکھا ہے۔

اسی طرح اگر کوئی محروم ایمان جا کر اس مرد مجاہد کی بیوی کے کان بھرے کہ دیکھو تمہیں بھوکا مرنے کیلئے پیچھے چھوڑے جا رہا ہے تو وہ مومنہ خاوند کا دامن پکڑنے کے بجائے پورے اعتماد کے ساتھ کہتی ہے۔

زوجی عرفته' اکّالا ولم اعرف رزاقا فان ذهب الا کال فقد بقِیَ الرزاق.

میں اپنے خاوند کو کھانے والے کی حیثیت سے جانتی ہوں رازق کی حیثیت سے نہیں اگر کھانے والا چلا گیا تو کیا ہوا رزق دینے والا تو موجود ہے۔

پس ثابت ہوا کہ قضاء وقدر پر ایمان، انسان کو جرات واقدام کی صفت سے متصف کرتا ہے اس کے اندر شجاعت وبسالت پیدا کر دیتا ہے اسے عظیم کارنامے انجام دینے اور خطرات میں کود جانے کی تاب وتواں بخشتا ہے اور اس کی طبیعت میں ثبات واستقامت، حلم وتحمل اور صبر ورضا کے اوصاف حمیدہ کو پروان چڑھاتا ہے۔

۵۔ الایمان بالاخوۃ...... آخری چیز جس سے اہل ایمان کو احساس تقویت ہوتا ہے وہ

دوسرے ایمان دار بھائیوں کا وجود ہے۔ وہ بھائی کہ جو اس کی خدمت وخیر خواہی کیلئے وقف ہوتے ہیں اس کی موجودگی میں ہرطرح اس کے مددگار ہوتے ہیں اوراس کی غیر حاضری میں اس کے حقوق کے محافظ جو دکھ تکلیف میں اس کیلئے سامان انس اور بوقت لغزش اس کے دستگیر ہوتے ہیں۔ جب اس کے قوی جواب دے جائیں تو وہ اسے سہارا بہم پہنچاتے ہیں جب کوئی کام کرنے لگے تو اس کے شریک کار بنتے ہیں، اور جب وہ میدان جہاد وقتال میں مصروف حرب وضرب ہوتا ہے تو دوسرے اہل ایمان اس کے دوش بدوش لڑتے ہیں۔ ایک ہزار ایماندار جب کسی دشمن کی جمعیت پر حملہ آور ہوتے ہیں تو ان میں سے کوئی بھی خود کو تنہا محسوس نہیں کرتا بلکہ ہرایک اپنے آپ کو ہزار ہزار کی قوت سے سرشار پاتا ہے یا بالفاظ دیگر وہ ہزار افراد تن واحد کی صورت میں ہوتے ہیں کہتے ہیں کہ مسلمانوں کا ایک لشکر دشمن کی فوج کے سامنے صف آرا تھا اور درمیان میں ایک دریا حائل تھا۔ سپہ سلالار نے حکم دیا کہ دریا میں چھلانگیں لگا دو اور پار کر کے دشمن پر حملہ آور ہو جاؤ۔ چنانچہ دیکھتے ہی دیکھتے سارا لشکر اسلام دریا میں تھا دوسری طرف دشمن حیران تھا کہ یہ انسان ہیں یا کوئی دوسری مخلوق وسط دریا میں جب یہ لشکر پہنچا تو سب نے غوطہ لگایا اور دشمن نے خیال کیا کہ غرق ہو گئے۔ مگر لشکر اسلام پھر نمودار ہو گیا۔ دشمنان اسلام ایک دوسرے سے استفسار کرنے لگے یہ ماجرا کیا ہے؟ آخر انہیں پتہ چلا کہ کسی سپاہی کا پیالہ دریا میں گر گیا تھا اور وہ چیخا ''میرا پیالہ'' میرا پیالہ'' یہ سننا تھا کہ سب سپاہی اپنے بھائی کا پیالہ تلاش کرنے کی غرض سے پانی میں نیچے چلے گئے اس ہمدردی وخیر خواہی کا نتیجہ یہ نکلا کہ دشمن کی فوج سوچنے لگی ایک پیالہ دریا میں گر جانے پر یہ لوگ تعاون وایثار کا اتنا بھرپور مظاہر کرتے ہیں تو اگر ہم نے خود ان میں سے کسی کو قتل کر دیا تو نہ معلوم یہ ہمارے ساتھ کیا سلوک کریں۔ اسی احساس نے ان کی کمر ہمت توڑ دی ان کے حوصلے پست ہو گئے اور مسلمانوں کے جذبہ اخوت کے سامنے دشمن گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو گیا۔

ایمان جتنا مضبوط ہو قوت کا احساس اتنا ہی شدید ہوتا ہے:۔

مندرجہ بالا سطور میں عرض کیا جا چکا ہے کہ اللہ پر ایمان، حق وصداقت پر ایمان، خلود حیات پر ایمان اور قضاء وقدر اور آخرت پر ایمان ہی درحقیقت ایک انسان کے مصادر قوت ہیں اب یہ بات بھی ذہن نشین کر لیجئے کہ مذکورہ بالا حقائق پر جتنا کسی کا ایمان پختہ ہوتا ہے اتنا ہی وہ خود کو قوی

محسوس کرتا ہے۔ رسول اللہؐ کی وفات کے بعد جو حوصلہ شکن حالات پیدا ہو گئے تھے اور ان میں جس طرح سیدنا ابوبکرؓ نے امت کو سہارا دیا اسے دیکھتے ہوئے جناب فاروق کو اعتراف کرنا پڑا ''واللہ لووزن ایمان ابی بکر بایمان ھذہ الامۃ لرجع...... بخدا اگر ابوبکرؓ کا ایمان ایک پلڑے میں رکھ دیا جائے اور پوری امت مسلمہ کا ایمان ترازو کے دوسرے پلڑے میں تو ابوبکرؓ کا پلڑا ہی جھکے گا۔ رسول پاکؐ کی وفات کے صدمہ سے بڑے بڑے صحابہؓ کے اوسان خطا ہو گئے تھے خود عمر فاروقؓ وقتی طور پر اپنے حواس کھو بیٹھے اس موقع پر جناب صدیقؓ کا یہ اعلان ان کی زبردست قوت ایمان کا کھلا ہوا ثبوت ہے۔

من کان یعبدُ محمدًا فان محمد قدمات ومن کان یعبد اللہ فِانَّ اللہ حٌ لایموت.

جو شخص محمدؐ کی پرستش کرتا تھا وہ سن لے کہ محمدؐ وفات پا چکے ہیں اور جو خدائے واحد کا پرستار (اس کیلئے خوف اور گھبراہٹ کی کوئی بات نہیں کیونکہ) اللہ تعالیٰ زندہ ہے اسے موت اور فنا نہیں۔

جیش اسامہؓ جسے شام کی طرف بھیجنے کا فیصلہ رسول اللہؐ وفات سے قبل فرما چکے تھے حضورؐ کی وفات کے بعد عام اصحاب رسولؐ اس کی روانگی کو اس احساس کے تحت موخر کر دینا چاہتے تھے کہ آپؐ کی وفات کی خبر قبائل عرب میں نہ معلوم کیا رد عمل پیدا کرے لہٰذا اس امر کے متحقق ہونے تک کہ وہ اسلامی حکومت کا ساتھ بھی دیتے ہیں یا نہیں جیش نہ روانہ کیا جائے مگر حضرت ابوبکر صدیقؓ جناب رسالتمآبؐ کا یہ فیصلہ ہر قیمت پر نافذ کر دینا چاہتے تھے۔ ان کا موقف یہ تھا کہ اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں ابوبکر کی جان ہے اگر میرا گمان یہ ہوتا کہ درندے میری بوٹیاں نوچ لیں گے۔ پھر بھی جیش اسامہؓ کو روانہ کر کے رہتا جیسا کہ رسول پاکؐ نے اس کی روانگی کا حکم صادر فرمایا ہے اور اگر لشکر بھیجنے کے بعد میں کہیں تن تنہا رہ جاؤں پھر بھی آپ کے فیصلہ کو نافذ کر کے رہونگا۔ غور فرمائیں سیدنا ابوبکر صدیقؓ یہ باتیں کس برتے پر کر رہے تھے؟ انہیں کس قوت وطاقت کا سہارا تھا؟ وہ تنہا تھے پھر بھی اپنے موقف پر ڈٹے ہوئے تھے۔ یہ سب کچھ محض قوت ایمانی کا نتیجہ تھا۔ اسی طرح مرتدین ومانعین زکوٰۃ کا معاملہ جب پیش آیا تو بعض لوگوں نے مشورہ دیا۔

یا خلیفۃ رسولِ اللہ لا طاقۃَ لک بحرب العرب جمعیا الزم بیتک واغلق

بالد واعبد ربک حتی یاتیک الیقین.

اے رسول اللہ کے جانشین آپ میں سارے عرب کے ساتھ لڑائی کرنے کی طاقت نہیں لہٰذا دروازے بند کر کے اپنے گھر بیٹھ رہیے اور اپنے پروردگار کی عبادت کیجئے تا آنکہ موت آ جائے۔

اس قسم کی رائے جب حضرت عمرؓ کی طرف سے بھی آئی تو آپ نے نہایت سختی سے اس کا نوٹس لیا اور انہیں مخاطب کر کے فرمایا: ''أجبارٌ فی الجاھلیة خوار فی الا سلام یا ابن الخطاب ۔'' خطاب کے بیٹے!! جاہلیت میں تم بڑے دلیر تھے اسلام قبول کر کے بزدل ہو گئے ہو۔ یاد رکھو وحی مکمل ہو چکی ہے اور زکوٰۃ کا نصاب مقرر ہے میرے جیتے جی اس میں کمی نہیں ہو سکتی۔ خدا کی قسم اگر مانعین زکوٰۃ نے مجھے اونٹ باندھنے کی رسی بھی دینے سے انکار کیا جسے وہ رسول اللہؐ کے زمانہ میں ادا کرتے تھے تو میں ان سے جنگ کروں گا۔ خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہد خلافت کے یہ چند واقعات اس لیے نقل کئے گئے ہیں تا کہ اندازہ ہو سکے کہ مضبوط ایمان کے حامل لوگ کتنی غیر معمولی طاقت کے مالک ہوتے ہیں کس طرح تن تنہا وہ بڑی بڑی جمعیتوں سے ٹکرا جاتے ہیں اور اپنے عزم محکم کی بناء پر ایک دنیا کی دنیا کے خیالات ونظریات تبدیل کر کے اسے اپنا ہمنوا بنا لیتے ہیں۔

یہ ایمان محکم انہیں ہر حال میں عدل وانصاف پر قائم رکھتا اور حق وصداقت کا ترجمان بنا دیتا ہے مادی سہاروں کی کوئی اہمیت ان کی نظر میں باقی نہیں رہتی پھٹکتا اور اپنے وقت کے جابر ومستبد حکمرانوں کو وہ پرکاہ کے برابر بھی نہیں سمجھتے۔ یہ سب باتیں محض زبانی باتیں نہیں بلکہ تاریخ کے صفحات ان سے بھرے پڑے ہیں۔

*****

العلم والایمان

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اس دور کا انسان جو علم کے لحاظ سے بام عروج تک پہنچ چکا ہے دین وایمان اور مذہب کے اصول وضوابط کا حاجت مند نہیں ہے وہ مجرد علم کی بنیاد پر زندگی کا صحیح رخ متعین کر سکتا ہے۔ اور اپنے معاملات میں نظم وتوازن پیدا کر کے بہتر طور پر جی سکتا ہے نیز وہ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ علم کا پیش کردہ نظریۂ زندگی عقلی ونفسیاتی لحاظ سے درست ہوگا جبکہ ان کے نزدیک مذہب ایمان بالغیب جیسے غیر علمی نظریات سے ذہنوں کے اندر خلجان پیدا ہوتا ہے۔ دوسری چیز جوان پرستاران علم کیلئے زیادہ کشش رکھتی ہے وہ ہے حریت فرد، ان کے خیال میں مذہب نے حلال وحرام کے نام سے فرد کی آزادی کو قدم قدم پر پامال کیا ہے لہٰذا جب انسان محض علم کی رہنمائی میں زندگی بسر کرے گا تو وہ اپنی آزادی کا تحفظ کر سکے گا تیسری چیز جوان کے نظریے کے مطابق علم کے حق میں جاتی ہے وہ حیات دنیا اور اس کی ترقی کیلئے بھرپور کوشش ہے کیونکہ دین دنیا کو کوئی اہمیت نہیں دیتا اور اس کی نظر میں تمام اہمیت عالم آخرت کو حاصل ہے پس جب ایک چیز کی قدر وقیمت کا ہی دین قائل نہیں تو وہ اس کے حصول کیلئے زور کیسے دے سکتا ہے۔ لیکن علم کی روشنی میں جب زندگی بسر ہوگی تو حیات دنیا کی طرف انسان بھرپور توجہ دے سکے گا۔

یہ وہ تین امور ہیں جن کی بنیاد پر آج کا ذی علم انسان دین ومذہب سے گریزاں ہے اور ایمان کی افادیت کا منکر ذیل میں ہم اس امر کا جائزہ لیں گے کہ مذکورہ بالا دعادی اپنے اندر کس حد تک صداقت رکھتے ہیں؟

علم اور ایمان کے مختلف دوائر عمل:۔

علم کی ایک حد ہے جہاں سے وہ آگے نہیں جا سکتا۔ یعنی مادہ اور محسوسات کی محدود دنیا علم مشاہدات وتجربات کر سکتا ہے اور اپنے تجربات سے صحیح یا غلط نتائج اخذ کر سکتا ہے رہی یہ بات کہ حس سے ماوراء اور مادہ سے آگے کیا ہے؟ تو علم اس باب میں بالکل خاموش ہے علم کی رسائی حقائق اشیاء کے ایک حصہ تک ہے یعنی اس کے ظاہری پہلو تک باطن کے بارے میں علم کچھ نہیں جانتا۔ موجود اشیاء کیا ہیں اور کیسے ہیں؟ مادی چیزوں کے بارے میں علم صرف انہی سوالات کا

جواب دے سکتا ہے رہا یہ سوال کہ یہ کیوں ہیں تو اس کا جواب دینا علم کے بس کی بات نہیں یہ ایمان کا کام ہے مادہ کا محرک اول کیا ہے؟ موجودات کی غایت الغایات کیا ہے محسوسات ومشاہدات سے ماورا کیا ہے اور ظاہر اشیاء کا باطن کیا ہے؟ ان سب سوالات کا نہایت شافی جواب صرف ایمان کے پاس ہے آدمی مر کے کہاں جاتا ہے؟ روح انسانی کی حقیقت کیا ہے؟ انسان کا اس کائنات کے ساتھ ربط وتعلق کیا ہے؟ عالم افلاک اور سیاروں کو کس عظیم طاقت نے ایک زبردست انتظام میں جکڑ رکھا ہے؟ کیوں جکڑ رکھا ہے؟ اس کائنات کی ابتداء کب ہوئی اور اس کی انتہا کیا ہے ان تمام امور سے بحث صرف ایمان کرتا ہے۔ علم وعقل کے پر اس مقام پر جلنے لگتے ہیں پس یہ بات ثابت ہوگئی کہ مجرد علم پر انحصار کرنے والے حقائق سے پوری طرح آگاہ نہیں ہو سکتے اور ان کیلئے یہ ایمان ہی کے محتاج ہیں تو جس علم کی بے چارگی وکوتاہی کا یہ عالم ہے اس کے پرستاروں کی ضلالت اور حقیقت سے بعد کا اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں۔

علم کے نتائج قطعی ویقینی نہیں ہوتے:۔

علم کا دوسرا نقص یہ ہے کہ اس کے اخذ کردہ نتائج بلحاظ صحت قطعی ویقینی نہیں ہوتے تاریخ میں علم کے ساتھ بارہا یہ حادثہ پیش آیا ہے کہ ایک وقت میں علم نے جس چیز کو مسلمہ حقیقت قرار دیا بعد کے ادوار میں وہ ازقسم اوہام واباطیل سمجھی گئی۔ اس سلسلہ میں ایک امریکی[1] اسکالر کے تاثرات ملاحظہ کیجئے علوم تجربہ شدہ حقائق کا نام ہے لیکن یہ حقائق انسان کے اوہام وخیالات سے بھی متاثر ہوتے رہتے ہیں نیز انسان کا...... ان حقائق کے ملاحظہ ووصف واستنتاج میں دقتِ نظر سے کام نہ لینا بھی ان پر اثر انداز ہوتا ہے۔ بنابریں نتائج علوم ایک تو اشیاء کی کیفیت وکمیت تک محدود ہوتے ہیں۔ دوسرے احتمالات سے شروع ہوکر احتمالات پر ہی ختم ہوجاتے ہیں ان کے بارے میں یہ کہنا مشکل ہے کہ ان کی صحت یقینی ہے زیادہ سے زیادہ جو بات کی جاسکتی ہے وہ ان کا اقرب الی الصحت ہونا ہے تاہم خطاواحتمال سے پاک وہ بہرحال نہیں ہوتے۔

1. امریکی مصنف مارت استانلی کونجدن کا مقالہ کتاب اللہ تجلی فی عصر العلم میں۔

علمی پختگی ایمان کی طرف رہنمائی کرتی ہے:۔

علم سے مکمل رہنمائی حاصل کرنے کے مدعی حضرات نے علم کو ایمان کے بالمقابل لاکھڑا کیا ہے حالانکہ علم، ایمان کا حریف نہیں نہ اس کا مدمقابل ہے بلکہ ایمان کی طرف رہنمائی کرنے والی ایک چیز ہے تاریخ میں بہت سے راسخین فی العلم ایسے نظر آتے ہیں جن کے علم نے ان کی حقیقت کی طرف راہنمائی کی ہے اور وہ اس نتیجہ تک پہنچ گئے کہ اس کائنات کے پیچھے ایک برتر قوت ایسی موجود ہے جو اس کی تدبیر وانتظام فرما رہی ہے اور جس نے ہر چیز کو ٹھیک ٹھیک اندازے سے اس کے اصل مقام پر رکھا ہے ایک عالم کیلئے اس امر کو جاننا دوسروں کی بہ نسبت آسان ہے کہ کائنات کے ذرے ذرے میں کتنا ربط ونظم اور کتنا استحکام پایا جاتا ہے اسے سموات والارض کی تخلیق میں رات اور دن کے اختلاف میں سمندر کے سینہ پر رواں دواں کشتیوں اور جہازوں میں اور آسمان سے نازل ہونے والے پانی میں اللہ کی بے حد بے حساب نشانیاں نظر آتی ہیں۔ ہواؤں کی گردش میں آسمانوں اور زمین کے مابین مسخر بادلوں میں اور روئے زمین پر انسانوں جانوروں اور دوسری مخلوقات کے وجود میں جو اسرار ورموز پوشیدہ ہیں اس کا علم اسے ان کی مکمل معرفت بخشتا ہے اور نتیجۃً اس کا سر خدائے حی قیوم کی چوکھٹ پر جھک جاتا ہے استاذ ہوشنل رقم طراز ہے علم میں جیسے جیسے وسعت آتی ہے ایک ازلی وابدی خالق کے وجود پر دلالت کرنے والی براہین میں اضافہ ہوتا جاتا ہے، وہ خالق ایسا ہے کہ جس کی قدرت کی کوئی حد نہایت نہیں۔ پس آج ماہرین حیاتیات، ریاضی دان، ہیئت دان اور ماہرین طبیعات نے علم کے جس عظیم الشان قصر کی تزئین کی ہے وہ درحقیقت اللہ وحدہ لاشریک کی عظمت کا قصر ہے۔

اسی معنی میں ہربرٹ سپنسر لکھتا ہے علم اوہام وخرافات کی تردید تو کرتا ہے لیکن دین کی تردید کبھی نہیں کرتا۔ آج اکثر وبیشتر علم طبیعی میں الحاد وزندقہ کی روح سرایت کئے ہوئے ہے۔ حالانکہ علم صحیح حقائق کی گہرائیوں میں جاگزیں ہے اس روح سے قطعی طور پر بیزار ہے علم طبیعی دین کے منافی نہیں بلکہ اس علم میں رسوخ پیدا کرنا اور اس کی طرف توجہ دینا تو ایک لحاظ سے عبادت کرنا ہے ایک طرح کی تسبیح خوانی ہے ایسی تسبیح جو زبان کی حرکت سے نہیں بلکہ تجربہ وعمل سے تعلق رکھتی ہے ڈاکٹر ڈی نومی جو نہایت ذی علم طبیب ہیں علم طبیعی پر کلام کرتے ہوئے لکھتے ہیں بہت سے سمجھ

دار اور بزعم خود نیک نیت لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ اللہ پر ایمان نہیں لا سکتے کیونکہ وہ اللہ کی حقیقت سمجھنے سے قاصر ہیں۔ حالانکہ ایک علمی شوق رکھنے والا آدمی کا تصور زیادہ سے زیادہ اتنا ہی کر سکتا ہے جتنا کہ وہ بجلی کے بارے میں کیئے ہوئے ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ دونوں کے بارے میں اس کے تصور کی نوعیت بالکل ناقص ہے۔ بجلی اپنا کوئی مادی وجود نہیں رکھتی باایں ہمہ ایک لکڑی کے ٹکڑے سے جو بہر حال مادی وجود رکھتا ہے زیادہ بہتر طور پر اپنا وجود حضرت انسان سے منوالیتی ہے پس اللہ تعالیٰ کے مادی وحسی وجود پر اصرار کرنا اور ماننے کیلئے اسے شرط لازم قرار دینا ایک غیر علمی بلکہ احمقانہ حرکت ہے۔

اہل علم کی ان تصریحات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ علم ایمان کا بدل کبھی نہیں ہو سکتا بلکہ علم صحیح ایمان کی صداقت کا شاہد عادل ہے ایمان کی منزل تک پہنچانے والی ایک روشنی ہے بجائے خود منزل نہیں۔

عقل ونفسیات کا معاملہ:۔

ایمان سے ہٹ کر جو نظریہ زندگی خالص علمی بنیاد پر اختیار کیا جائیگا کہا جاتا ہے کہ وہ عقل ونفسیاتی اعتبار سے درست ہوگا لیکن واقعات اس امر کی تکذیب کرتے ہیں اور مغرب کے مادی تمدن نے بھی اس کی نفی کر دی ہے مغرب کے اہل علم کا دعویٰ تھا کہ وہ اپنے تجربی علم اور فنی ترقی کی بنیاد پر ایسا نظریہ حیات اور ایسے اصول زندگی دریافت کر لیں گے جو عقلی ونفسیاتی لحاظ سے درست ہوں گے برطانوی مورخ اور فلسفی ٹائن بی کی شہادت 'سنیئے' میں نے صنعتی فنون کی گہرائی میں ڈوب کر دیکھا تو محسوس کیا کہ ان انسانوں نے اپنی زندگی کی باگ ڈوران کے ہاتھ میں دے رکھی ہے اور انہوں نے پرانے دیوں کی جگہ پر کچھ نئے چراغ خرید لئے ہیں۔ یہ گمراہی اس درجہ بڑھ گئی ہے کہ انسانوں نے اپنی جانوں کا سودا کر لیا اور بدلے میں سینما اور ریڈیو لے لئے اس تہذیبی تباہی...... جس کا سبب تازہ ترین لین دین تھا کا نتیجہ یہ نکلا کہ قلب وروح کی دنیا برباد ہوگئی۔ ایسے ہی معاشرہ کو افلاطون نے خنزیروں کا معاشرہ قرار دیا تھا اور الڈس ہکسلے نے اسی کو ایک نئے ظاہر فریب مگر تاریک باطن جہان سے تعبیر[1] کیا اس بحث کے اختتام پر ٹائن بی لکھتا ہے: اب مغرب

[1] کوکالن ولسن نے اپنی کتاب ۔سقوط الحضارۃ۔ میں اسے نقل کیا۔

کی نجات اس میں ہے کہ اپنے نظام معیشت سے رخ پھیرے اور دین کی طرف رجوع کرے۔

لیکن ٹائن بی ہمیں یہ نہیں بتاتا کہ اس انتقال کی صورت کیا ہو؟ وہ صرف یہ تاکید کرتا ہے مغرب کا انسان صرف دین کی وساطت سے وہ روحانی بالادستی حاصل کر سکتا ہے جو مادی قوت سمیت اس کی سلامتی کی ضامن ہے جسے اس وقت مغربی صنعت کے مشینی دور نے نظر انداز کر رکھا ہے۔

ڈاکٹر الیکس کریل جنہوں نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ تجربہ گاہوں میں گزارا ہے اور جو جدید علم کا وافر ذخیرہ اپنے پاس رکھتے ہیں رقم طراز ہیں۔ تعجب ہے کہ دماغی امراض دوسرے تمام امراض سے زیادہ پائے جاتے ہیں اور شفاخانہ ہائے امراض دماغی پاگلوں سے بھرے پڑے ہیں اور نئے مریضوں کیلئے ان میں کوئی جگہ نہیں۔ س۔و۔ بیرس کا تجزیہ یہ ہے کہ نیویارک کے ہر بائیسباشندوں میں سے ایک دماغی امراض کے ہسپتال میں داخلہ کا مستحق ہوتا ہے۔ ڈاکٹر کریل مزید لکھتے ہیں ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے شفاخانوں میں پاگلوں کا علاج بڑی توجہ سے کیا جاتا ہے جن کی تعداد دق اور سل کے مریضوں سے آٹھ گنا زائد ہوتی ہے وہاں ہر سال چھیاسی ہزار کے لگ بھگ افراد دماغی امراض کے ہسپتالوں میں داخل ہوتے ہیں۔ اگر اسی رفتار سے لوگ پاگل ہوتے رہے تو لاکھوں کروڑوں بچے اور جوان جو اس وقت سکون اور کالجوں میں جاتے ہیں جلد یا بدیر انہیں نفسیاتی بیماریوں کی وجہ سے ہسپتالوں میں داخلہ لینا پڑے گا۔ ڈاکٹر موصوف ایسے ہی مزید کئی اعداد وشمار دینے کے بعد لکھتے ہیں یہ اعداد وشمار بتاتے ہیں کہ دور جدید کا متمدن انسان تباہی سے دوچار ہے اور جدید معاشرہ میں دماغی صحت کا مسئلہ کتنی اہمیت اختیار کر گیا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ دماغی امراض ہیں ہی نہایت خطرناک یہ دق سل سرطان اور گردہ ودل کے امراض سے زیادہ خطرناک ہیں بلکہ تپ محرقہ، طاعون اور ہیضہ بھی ان کے سامنے ہیچ ہیں پس اس پہلو سے ہی یہ امراض لائق اعتناء نہیں کہ ان سے مجرموں کی تعداد میں اضافہ ہوتا ہے بلکہ اس لحاظ سے بھی ان کے فوری سدباب کی کوشش کرنی چاہیے کہ ان کی بنا پر وہ تفوق اور برتری متاثر ہو رہی ہے جو سفید فام نسلوں کو دوسری انواع بشر پر حاصل ہے۔

اسی سلسلہ سے تعلق رکھنے والی ایک خبر ملاحظہ فرمائیے: امریکہ کی پولیس نے باغی ادیبوں کی ایک انجمن کے دسیوں ارکان کو گرفتار کر لیا اس کا سبب شعر وادب پہ مبنی ان کی قابل اعتراض

تخلیقات ونگارشات نہ تھیں بلکہ ان کا عیب ناک رہن سہن ان کا بکثرت افیون کھانا اور نشہ آور اشیاء کے استعمال کا خطرناک طور پر دفاع کرنا تھا ان کی گرفتاری پر انجمن ہی کے ایک ممبر ولیم رارک نے احتجاج کرتے ہوئے کہا زندگی تلخ وترش ہوگئی ہے اور لوگ مسلسل تعب ومشقت کا شکار ہیں اب اس نشہ کے روگ سے مفر کی کوئی صورت نہیں سواء اس کے کہ لوگ اپنے آپ کو دنیا کے خواب وخیال میں پہنچادیں اور بے کاری وسستی کے مزے لوٹیں۔

یہ ہے وہ نفسیاتی وعقلی اعتبار سے صحیح دور زندگی جسے مغرب کے اہل علم نے دین وایمان سے ہٹ کر دریافت کیا ہے اور جس پر جدید تہذیب وتمدن کو ناز ہے اور جس کے تلخ وتاریک نتائج کو دیکھ کر مغرب ہی کے سلیم الفکر دانشور چیخ اٹھے ہیں اور اپنے ارباب حل وعقد کو دین وایمان کی طرف لوٹنے کا مشورہ دے رہے ہیں۔

شخصی آزادی اور اس کے نتائج:۔

ملحدانہ فکر کے علمبرداروں نے دین وایمان کے خلاف اس لئے بھی بہت پراپیگنڈاہ کیا ہے کہ مذہب انسان پر بے جا پابندیاں عائد کرتا ہے اور قدم قدم پر اس کی آزادی کو سلب کر لیتا ہے اس کے مقابلے میں انہوں نے بنام علم جو نظریہ زندگی پیش کیا ہے ان کا دعویٰ یہ ہے کہ اس میں آزادی فرد میں کہیں مداخلت نہیں کی گئی۔

جہاں تک ان حدود وقیود کا تعلق ہے جو عقیدہ اسلام میں انسان پر عائد کی گئی ہیں وہ فرد کی آزادی میں مداخلت نہیں بلکہ فرد اور معاشرے کے حقوق میں توازن کا قیام ہے۔ ایک شخص اگر بلا روک ٹوک خواہش نفس پوری کرنا چاہے تو بلاشبہ اسلام میں اس کی اجازت نہیں۔ ایک اور صاحب اگر کسی کی جیب پر ہاتھ صاف کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں تو ایسی آزادی کی بھی دین وایمان میں کوئی گنجائش نہیں فضائل اخلاق کو چھوڑ کر اگر کوئی رذائل اختیار کرتا ہے تو یقیناً اس کی بھی گرفت کی جائیگی زبان کا غلط استعمال طاقت کا ناروا مظاہرہ اور دولت کا ضیاع وبے جا صرف یہ سب ایسے کام ہیں جن کے ارتکاب کی اگر کھلم کھلا اجازت دے دی جائے تو معاشرتی زندگی کا امن وسکون غارت ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ پس جہاں تک اس آزادی کا تعلق ہے جس سے انسانوں کے باہمی حقوق سلب ہوجانے کا خطرہ ہے تو اس میں کوئی شک نہیں کہ ایسی آزادی دین وایمان کی رو

سے حرام اور ممنوع ہے۔ رہی وہ آزادی جو انسان کی شخصیت کی نشوونما کیلئے ضروری ہے اور جس سے دوسرے افراد کے حقوق اور مفاد ملک وقوم متاثر نہیں ہوتا۔ اس آزادی کو نہ صرف یہ کہ مباح قرار دیا گیا ہے بلکہ اس کے تحفظ کی بھی پوری ضمانت دی گئی ہے۔

اب آیئے ذرا اس معاشرے کی حالت کا جائزہ لیں جو خود کو علم وشعور سے بہرہ ور سمجھتا ہے اور جہاں نام نہاد شخصی آزادی پائی جاتی ہے اور دیکھیں کہ اس نے زندگی کی اعلیٰ اقدار کا کسی بے دردی سے خون کر ڈالا ہے۔

(ا) ایک برطانوی سوسائٹی جو جنسی بے راہروی کا علاج سوچنے کیلئے معرض وجود میں آئی تھی اس کی رپورٹ یہ ہے کہ برطانیہ میں دس لاکھ افراد اور بسا اوقات اس سے بھی زیادہ لوگ جنسی بے راہ روی میں مبتلا ہیں۔ (الاہرام، قاہرہ/مئی ۱۹۶۵ء)

(ب) سات کروڑ بیس لاکھ امریکی شراب پیتے ہیں جن میں سے دو کروڑ امریکی اپنے فرائض سے کوتاہی کے مرتکب ہوکر ہر سال حکومت کو کھربوں ڈالر کا نقصان پہنچاتے ہیں۔

(ج) سویڈش عورتوں نے جنسی آزادی کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے بھرپور مظاہرہ کیا اس مظاہرہ میں ملک کے ہر حصہ سے تعلق رکھنے والی خواتین نے شرکت کی جن کی تعداد تقریباً ایک لاکھ تھی۔

(د) جرائم ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی پیشانی پر کلنک کا داغ ہیں پولیس کے رجسٹر ایسے واقعات سے بھرے پڑے ہیں کہ تجارتی مقامات سے خرید وفروخت کے دوران لوگوں کی خرید کردہ اشیاء یا دوکانداروں کی چیزیں اچک لی گئیں اور خواتین کے بیگ تک ان سے چھین لیے گئے دوسری طرف ایوان ہائے عدالت سلب ونہب اور قتل وخونریزی کے مجرموں سے معمور ہوتے ہیں۔

امریکہ اور دوسرے یورپی ممالک جو علوم ومعارف اور تہذیب وتمدن کا گہوارا سمجھے جاتے ہیں کا حال یہ ہے کہ رہائشی علاقوں میں نصف سے زائد لوگ غروب آفتاب کے بعد گھروں سے باہر نکلتے ہوئے خوف محسوس کرتے ہیں اور ایک ثلث کے قریب ایسے حضرات ہوتے ہیں کہ قبیلے میں کسی اجنبی کو دیکھتے ہی جن کے چہرے کا رنگ اڑ جاتا ہے اور آبادی کا ایک خمس وہ اصحاب ہیں جو خوف واضطراب کے مارے نکل بھاگنا چاہتے ہیں لیکن نہیں جانتے کہ کدھر جائیں اور کہاں امن وسکون میسر آسکتا ہے؟ علاوہ ازیں ہر سال ان لوگوں کی تعداد بڑھتی جاتی ہے جو نقل مکانی کر

جاتے ہیں یا اپنے گھروں اور موٹروں میں بندوقیں اور دوسرا آتشیں اسلحہ رکھنے کے اجازت نامے حاصل کرتے ہیں نیز حفاظت ونگہبانی کرنے والے موٹے تازے درندہ صفت کتوں کا وجود تو گھروں کی فطری ضرورت بن چکا ہے۔

یہ سب نتائج کس بات کے ہیں؟ نام نہاد شخصی آزادی کے انارکی و بے راہ روی کے اور عقیدہ وایمان سے بے زاری کے۔ اب آپ غور فرمائیں کہ بدعنوانیوں اور جرائم سے بھرپور ایسے معاشرے کو کیا کوئی نسبت ہوسکتی ہے اس پرسکون اور خوشگوار معاشرے سے جسے عقیدہ وایمان جنم دیتا ہے جہاں کسی کی زبان اور ہاتھ دوسرے کے مال جان اور عزت پر حملہ آور نہیں ہوتا جہاں چوری اور ڈاکے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لوگ کامل یکسوئی اور اطمینان سے اپنے مال واسباب سے بھری ہوئی دوکانیں کھلی چھوڑ جاتے ہیں۔ جہاں ہر آدمی دوسرے کو بھائی سمجھتا ہے اور اس کی ہمدردی اور خیر خواہی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتا۔

ایمان اور حیات دنیا:۔

آخری سوال جو ایمان سے ہٹ کر زندگی بسر کرنے والے لوگ کرتے ہیں یہ ہے کہ عقیدہ ایمان حیات دنیا کیلئے سعی وجدوجہد کا قائل نہیں اس کی نظر میں دنیا کی زندگی کی کوئی اہمیت نہیں اور وہ تمام توجہ اخروی زندگی پر ہی مرکوز رکھتا ہے اس سوال کا جواب یہاں از سرنو شرح وبسط سے دینے کی ضرورت نہیں کیونکہ ایک گزشتہ باب میں ایمان کے محسوس نتائج کے زیر عنوان ہم اس پر کافی روشنی ڈال چکے ہیں۔ یہاں صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ ایمان پر مبنی تعلیمات دنیا کی زندگی کیلئے بھی اسی طرح رہنما اصول ہیں جس طرح کہ آخرت کیلئے۔ دنیوی زندگی کے مسائل ومشکلات کا ان میں حل بتایا گیا ہے اور ان سے زندگی بسر کرنے کا صحیح طریقہ معلوم ہوتا ہے۔ پھر آخر اس سوال میں کیا معقولیت ہے کہ ایمان حیات دنیا سے دلچسپی نہیں رکھتا۔ زیر نظر کتاب ''الایمان والحیٰوۃ'' کے سینکڑوں صفحات میں جن امور کو زیر بحث لایا گیا ہے ان کا تعلق دنیا کی زندگی سے ہی تو ہے البتہ یہ بات ضرور ہے کہ حیاتِ دنیا اور اس کے سروسامان سے وہ مجنونانہ وابستگی کا قائل نہیں کیونکہ یہ چیزیں بہر حال ناپائدار اور فانی ہیں تاہم ایک دانا وبینا شخص کو زوال پذیر اور فنا انجام اشیاء سے ان کی افادیت کے پیش نظر جتنا تعلق رکھنا چاہیے اور ان کے حصول کیلئے مناسب حدتک جتنی سرگرمی دکھانی چاہیے ایمان اس کا ضرور قائل ہے اس سے زیادہ کا نہیں۔

*****

الایمان والاصلاح

قوموں اور جماعتوں کی اصلاح بغیر کسی اصول وضابطہ کے محض اتفاقات کے تھپیڑوں سے نہیں ہو جایا کرتی جو قومیں گرنے کے بعد سنبھلنے اور اضمحلال کے بعد اپنے اندر قوت وتوانائی پیدا کرنے کی آرزومند ہوتی ہیں وہ اپنے سامنے تربیت واصلاح کا واضح پروگرام اور عزم رکھتی ہیں جن پر عمل پیرا ہوئے بغیر وہ رفعت اور سربلندی کا کوئی مقام حاصل نہیں کرسکتیں یہ اللہ تعالیٰ کی سنت ہے قرآن مجید میں اس اصول کی بڑے صاف الفاظ میں یوں نشان دہی کی گئی ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَابِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ.

اللہ تعالیٰ کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک کہ وہ اپنی حالت خود نہ بدلے۔

مگر اپنی حالت کو بدلنے والی بات بہت مشکل ہے دریاؤں کے رخ بدلنے آسان ہیں، زمین کا سینہ شق کرنا اور پہاڑوں کے جگر چھید ڈالنا ممکن ہے مگر قلوب ونفوس کے اندر تبدیلی بہت ہی مشکل ہے۔

اس ناممکن کو ممکن بنانے والی قوت صرف ایک ہی ہے اور وہ ہے ایمان کی قوت علمائے نفسیات کا کہنا ہے کہ انسان کی تربیت واصلاح کا ایک معین وقت ہوتا ہے یعنی سن الطفولۃ۔ اگر یہ وقت گزر جائے تو پھر تکوین عادات اور تہذیب واخلاق کی کوششیں رائگاں جاتی ہے۔ اسی طرح وہ اس امر کو بھی بہت اہمیت دیتے ہیں کہ آدمی جس ماحول میں پیدا ہوتا بڑھتا اور پروان چڑھتا ہے وہ بھی اس کے بناؤ بگاڑ کا بہت حدتک ذمہ دار ہوتا ہے لیکن ہم جس قوت ایمانی کا ذکر کر رہے ہیں اس کی معجز نمائی وکارفرمائی ہر آن مسلم ہے چاہے آدمی عمر کے کسی مرحلہ میں داخل ہو اور چاہے اس کے حالات اس کی تبدیلی کی راہ میں سنگ گراں بن کر کھڑے ہوں، ایمان کی ایک لہر ہی اس کے دل ودماغ کو بدل کر رکھ دیتی ہے۔

دربار فرعون سے وابستہ جادوگروں کی قلب ماہیت کو دیکھ لیجئے۔

قَالَ لِلْمَلَاِ حَوْلَهٗۤ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِيْمٌ. يُرِيْدُ اَنْ يُّخْرِجَكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهٖ فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ قَالُوْۤا اَرْجِهْ وَاَخَاهُ وَابْعَثْ فِى الْمَدَآئِنِ حٰشِرِيْنَ يَاْتُوْكَ بِكُلِّ

سَحَّارٍ عَلِيْمٍ. فَجُمِعَ السَّحَرَةُ لِمِيْقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ. وَقِيْلَ لِلنَّاسِ هَلْ اَنْتُمْ مُجْتَمِعُوْنَ. لَعَلَّنَا نَتَّبِعُ السَّحَرَةَ اِنْ كَانُوْا هُمُ الْغٰلِبِيْنَ. فَلَمَّا جَآءَ السَّحَرَةُ قَالُوْا لِفِرْعَوْنَ اَئِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ. قَالَ نَعَمْ وَاِنَّكُمْ اِذًا لَّمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ. قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰٓى اَلْقُوْا مَآ اَنْتُمْ مُّلْقُوْنَ. فَاَلْقَوْا حِبَالَهُمْ وَعِصِيَّهُمْ وَقَالُوْا بِعِزَّةِ فِرْعَوْنَ اِنَّا لَنَحْنُ الْغٰلِبُوْنَ. فَاَلْقٰى مُوْسٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِيَ تَلْقَفُ مَا يَاْفِكُوْنَ. فَاُلْقِيَ السَّحَرَةُ سٰجِدِيْنَ. قَالُوْا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ. رَبِّ مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ. قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ اِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِيْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ فَلَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ لَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ وَّلَاُوصَلِّبَنَّكُمْ اَجْمَعِيْنَ. قَالُوْا لَا ضَيْرَ اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ. اِنَّا نَطْمَعُ اَنْ يَّغْفِرَ لَنَا رَبُّنَا خَطٰيٰنَآ اَنْ كُنَّآ اَوَّلَ الْمُؤْمِنِيْنَ. (الشعراء. ۳۴تا ۵۱)

''فرعون اپنے گردوپیش کے سرداروں سے بولا یہ شخص یقیناً ایک ماہر جادوگر ہے اور چاہتا ہے کہ اپنے جادو کے زور سے تم کو تمہارے ملک سے نکال دے اب بتاؤ تم کیا حکم دیتے ہو انہوں نے کہا اسے اور اس کے بھائی کو روک لیجئے اور شہروں میں ہرکارے بھیج دیجئے کہ ہر ماہر جادوگر کو آپ کے پاس لے آئیں چنانچہ ایک مقررہ وقت پر جادوگر اکٹھے کر لیے گئے اور لوگوں سے کہا گیا کہ تم اجتماع میں چلو گے شاید کہ ہم جادوگروں کے دین ہی پر رہ جائیں اگر وہ غالب رہے جب جادوگر میدان میں آئے تو انہوں نے فرعون سے کہا ہمیں انعام تو ملے گا اگر ہم غالب رہے اس نے کہا ہاں اور تم تو اسی وقت مقربین میں شامل ہو جاؤ گے۔ موسیٰؑ نے کہا پھینکو جو تمہیں پھینکنا ہے انہوں نے فوراً اپنی رسیاں اور لاٹھیاں پھینک دیں اور بولے فرعون کے اقبال سے ہم ہی غالب رہیں گے پھر موسیٰؑ نے اپنا عصا پھینکا تو یکا یک وہ ان کے جھوٹے کرشموں کو ہڑپ کرتا چلا جا رہا تھا اس پر سارے جادوگر بے اختیار سجدے میں گر پڑے اور بول اٹھے کہ مان گئے ہم رب العالمین کو موسیٰؑ اور ہارون کے رب کو فرعون نے کہا تم موسیٰؑ کی بات مان گئے قبل اس کے کہ میں تمہیں اجازت دیتا ضرور یہ تمہارا بڑا ہے جس نے تمہیں جادو سکھایا ہے اچھا ابھی تمہیں معلوم ہوا جاتا ہے میں تمہارے ہاتھ پاؤں مخالف سمتوں سے کٹواؤں گا اور تم سب کو سولی پر چڑھا دوں گا۔ انہوں نے جواب دیا کچھ پرواہ نہیں ہم اپنے رب کے حضور پہنچ

جائیں گے اور ہمیں توقع ہے کہ ہمارا اب ہمارے گناہ معاف کر دے گا کیونکہ کہ سب سے پہلے ہم ایمان لائے ہیں''۔

غور کیجئے ان کی شخصیات کیسے بدل کر رہ گئیں کتنا بڑا اصلاحی انقلاب آناً فاناً ان کے اندر برپا ہو گیا کہاں ان کی سوچ کا یہ انداز کہ ''اَئِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغَالِبِيْنَ '' (ہمیں انعام تو ملے گا اگر ہم غالب رہے) اور کہاں یہ بلندی فکر کہ '' لَنْ نُّؤْثِرَكَ عَلٰى مَا جَآءَنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ '' (ہم تجھے کبھی ترجیح نہیں دے سکتے ان روشن دلائل پر جو ہمارے پاس آ چکے) اور پہلی نیازمندی کے مقابلے میں ذرا بعد کی جرات ایمانی کے تیور دیکھیے ''فَاقْضِ مَا اَنْتَ قَاضٍ '' تو ہمارے خلاف جو بھی فیصلہ کرنا چاہے کر لے۔

آج مغربی تاریخ دان حیران ہیں کہ باشندگان عرب جو بکریاں چرایا کرتے تھے قوموں اور ملکوں کے حکمران کیوں کر بن گئے۔ بادیہ نشین تمدن وحضارۃ کے رموز کیسے پا گئے اور انہیں فتح ونصرت کا کون سا گر ہاتھ آ گیا تھا کہ قیصر وکسریٰ کی باجبروت حکومتوں کے تختے الٹنے میں کامیاب ہو گئے لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں اور وہ راز بھی زیادہ دیر تک راز نہیں رہا بلکہ سرعیاں ہو چکا ہے عربوں کی کایا پلٹ دینے والی چیز اکسیر ایمان تھی جس کے ذریعے محمدؐ نے اپنے صحابہ کی زندگیوں میں محیّر العقول نقلاب پیدا کیا۔ اسی اکسیر کی بدولت ان کے حالات میں تغیر رونما ہوا ان کی انفرادی واجتماعی زندگی کا پورا ڈھانچہ تبدیل ہوا۔ بتوں کے پوجنے والے خدا پرست بن گئے اور جاہلیت کی تاریکیوں میں ٹھوکریں کھانے والوں کے سینے نور ایمان سے منور ہو گئے۔

اقفالِ حیات کیلئے واحد کلید:۔

حیات انسانی کا عظیم الشان قصر ہر طرف سے مقفل تھا اور اس کے دَردا ہونے کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی عقل انسانی مقفل تھی جسے حکماء وفلاسفر کھولنے سے عاجز تھے ضمیر انسان مقفل تھا اور واعظین ومرشدین اس کا تالا توڑنے میں ناکام ہو چکے تھے۔ دل ودماغ مقفل تھے جنہیں حوادث زمانہ کے تھپیڑے تک کھول نہ سکے تھے۔ مواہب وعطایا مقفل تھے اور کوئی تعلیم وتربیت ان پر اثر انداز نہ ہو رہی تھی مدرسہ مقفل تھا جسے کھولنے پر اساتذہ وعلماء قادر نہ تھے خاندانی نظام

مقفل تھا اور اس کے آگے مصلحین ومفکرین کی کوئی پیش نہ چلتی تھی قصر حکومت مقفل تھا جسے مظلوم عوام محنت کش کسان اور غریب مزدور اپنی متحدہ کوشش سے کھول نہ سکتے تھے۔ دولت مندوں کے خزانے مقفل تھے اور ان کے قفل غریبوں کی بھوک اور عورتوں اور بچوں کی برہنگی توڑ نہ سکتی تھی۔ عظیم مصلحین نے بار ہا یہ کوشش کی کہ ان تالوں کو توڑ دیا جائے تا کہ انسانیت کو زندگی کی حقیقی مسرتوں سے ہمکنار کیا جاسکے مگر بار ہا انہوں نے منہ کی کھائی۔

حیات انسانی کی اس مشکل کو بڑے بڑے دار الحکومتوں میں حل نہ کیا جا سکا۔ عظیم الشان یونیورسٹیاں اور درسگاہیں اس سے عاجز آ گئیں تو اللہ کی رحمت کو جوش آیا اور ایک پہاڑ کی چوٹی پر ایک چھوٹی سے غار میں فروکش انسانیت کے ایک عظیم محسن کے ہاتھ پر اس مشکل کو آسان کر دیا گیا اور تمام اقفال حیات کی کلید ان کی خدمت میں پیش کر دی گئی یعنی ایمان باللہ والرسول والیوم الآخر کی شاہ کلید جس نے ایک ایک قفل حیات کو کھول دیا۔

اس کلید نے عقل انسانی کا قفل کھول دیا اور وہ انفس وآفاق میں اللہ کی بے شمار نشانیاں دیکھنے کے قابل ہوگئی اور شرک وبت پرستی کی برائی کو محسوس کرنے لگی۔ اس نے خوابیدہ ضمیر انسانی کا قفل کھول دیا اور وہ بیدار ہو گیا اور شعور حقیقت سے بہرہ ور ہو کر خوب و ناخوب میں امتیاز کرنے لگا۔ اس نے ان دلوں کے قفل کھول دیئے جو نہ کسی چیز سے عبرت پکڑتے تھے نہ زجر وتوبیخ کا کوئی اثر ان پر ہوتا تھا اور نہ نرمی ورقت ان میں پیدا ہوتی تھی مگر ایمان باللہ کی کلید کے استعمال سے ان کے اندر خشوع وخضوع پیدا ہوا اور وہ حوادث روزگار سے عبرت پکڑنے لگے کسی مظلوم کو دیکھتے تو ان کے دل کے اندر ارتعاش پیدا ہو جاتا اور ضعیف وناتواں پر نظر پڑتی تو جذبات رحم وشفقت سے مملو ہو جاتے۔ اس سے پہلے حیات انسانی کا دامن اللہ کی عطا کردہ صلاحیتوں اور دیگر مواہب وقویٰ سے معمور تو تھا مگر یہ تمام استعدادیں مقفل تھیں۔ ایمان باللہ کی کلید نے یہ اعجاز دکھایا کہ انسان کی جملہ مخفی استعدادیں اجاگر کر دیں اور دیکھتے ہی دیکھتے بھیڑ بکریوں اور اونٹوں کے چرانے والے اقوام وملل کے پاسبان بن گئے۔ نیابت الٰہی سے ہمکنار ہو کر عالم پر حکمرانی کرنے لگے اور جو قبیلوں کے سردار تھے وہ ممالک ودول کی قیادت وسیادت پر فائز ہو گئے اس کلید نے درسگاہوں اور دانشکدوں کے قفل کھول دیئے اور دنیا کو علم کے شرف سے آگاہی نصیب ہوئی اور

عالم ومتعلم اور مربی ومعلّم کے فضل وتفوق پر رشک کرنے لگی گھر گھر تدریس وتعلیم کی مسند بچھ گئی اور ہر بوڑھے اور نوجوان کیلئے زیور علم سے آراستہ ہونا ضروری ٹھہرا اسی کلید نے عدل وانصاف کے مقفل ایوان تک اہل علم کو رسائی بخشی چنانچہ حکام وقضاۃ عدل وانصاف اور پوری احساس ذمہ داری کیساتھ اپنے فرائض ادا کرنے لگے اور مظلوموں اور ستم کشوں کے دن پھر گئے اور ظلم وجور سے معمور خدائی، رحمت الٰہی کا گہوارہ بن گئی اس کلید کے ہاتھ لگنے سے پہلے خاندانی نظام تہ وبالا تھا۔ بیٹا باپ کے حقوق پر دست درازی کر رہا تھا اور بھائی بھائیوں کو لوٹنے کے درپے تھے اور بڑے چھوٹوں پر۔ ان حالات میں ایمان باللہ کی کلید نے ہر ایک کو دوسرے کے حقوق یاد دلائے اور ان کا تحفظ کرنا سکھایا، باہمی رحمت ومؤدت پر تعلقات استوار کیئے۔ خدا کا خوف اور آخرت کی فکر دلوں پر مسلط کی اور اس حقیقت کا گہرا شعور بخشا کہ آدمیت، انسانیت کے احترام اور انسانیت کی خدمت کا نام ہے۔ معاشرتی زندگی کی چولیں ڈھیلی ہو چکی تھیں انہیں پھر سے کس دیا اور معاشرہ میں عدل واخوت کی روح دوڑا دی، خیر خواہی وہمدردی کے جذبات پیدا کر دیئے۔ قوم کا سردار قوم کا خادم بن گیا اور امراؤاغنیاء نے اپنی دولت کا رخ غربا ومساکین اور محروم لوگوں کی طرف پھیر دیا۔

قصہ مختصر یہ کہ افراد معاشرہ کی اصلاح کیلئے جتنا مؤثر کردار ایمان ادا کرتا ہے اور کوئی چیز نہیں کرتی لہٰذا جس طرح کلید ایمان سے سینکڑوں سال پہلے معاشرہ مبدل اصلاح ہو گیا تھا اسی طرح دور جدید کے تمام مشکل مسائل حیات کو بھی ایمان کی بنیاد پر حل کیا جا سکتا ہے۔ اور یہ بات بالکل غلط ہے کہ جدید مسائل حیات کیلئے یہ قدیم کلید کارآمد نہیں اصل بات یہ ہے کہ نہ مسائل جدید ہیں اور نہ ان کے حل کیلئے کسی جدید کلید کی ضرورت ہے کیونکہ۔

زمانہ ایک حیات ایک کائنات بھی ایک
دلیل کم نظری قصہ جدید وقدیم!

زندگی کے مسائل جو آج سے ہزاروں سال پہلے تھے وہی آج بھی فکر انسانی پر تسلط جمائے ہوئے ہیں۔ فرق جو کچھ پڑا ہے وہ صرف یہ ہے کہ یہ مسائل نئے رنگ میں سامنے آئے ہیں آج سے ہزاروں سال پہلے انسان کو امن کی ضرورت تھی اور آج بھی انسان اس کا بشدت ضرورت مند ہے آفات ارضی وسماوی، دکھ تکلیفیں اور بیماریاں پہلے بھی انسانوں کو لاحق تھیں اور آج بھی ہیں۔

انسان ایک دوسرے کے حقوق پر پہلے بھی ڈاکہ ڈالتا تھا اور آج اس تہذیب وتمدن کے روشن دور میں بھی یہ ڈاکہ زنی عام ہے، جھوٹ مکروفریب، وعدہ خلافی وبدعہدی جیسے اوصاف رذیلہ اس زمانے میں بھی انسان کیلئے مضر تھے جب وہ اونٹوں اور گدھوں پر سواری کرتا تھا اور آج بھی جب کہ وہ کاروں اور جٹ طیاروں میں سفر کرتا ہے۔ ان کی مضرت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ ظلم وجور، انسانوں کا انسانوں کے ہاتھوں استحصال پتھر کے زمانے میں بھی ہوتا تھا اور آج بھی جب ایٹم کا دور ہے استبداد واستحصال پر مبنی کاروائیاں جوں کی توں ہیں خدا کے خوف سے عاری لوگوں اور انبیاء ورسل کی تعلیمات سے انحراف کرنیوالوں کی پہلے بھی کمی نہ تھی اور آج بھی کمی نہیں مرد وعورت اور فرد معاشرہ کے تعلقات میں عالم انسانی افراط وتفریط کا پہلے بھی شکار رہا ہے۔ اور آج بھی ہے پس جب زندگی کے مسائل اپنی حقیقت کے اعتبار سے پرانے ہی ہیں تو کیا مضائقہ اگر ان کا علاج بھی وہی اختیار کرلیا جائے جو صدیوں سے شافی ثابت ہو رہا ہے۔ یعنی

آمَنْتُ بِاللّٰہِ وَمَلٰٓئِکَتِہٖ وَکُتُبِہٖ وَرُسُلِہٖ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ۔

صفت ایمان سے متصف افراد ہی درحقیقت اصلاح یافتہ افراد ہوتے ہیں جن سے صالح معاشرہ وجود میں آتا ہے اور صالح معاشرہ ہی اصلاح افراد کا بھی ضامن ہوتا ہے۔ اس طرح ایمان افراد معاشرہ کو بیک وقت صالح ومصلح کی سی حیثیت دے کر معاشرتی زندگی کے اردگرد ایک زبردست حصار قائم کردیتا ہے جو اس میں سے ایمان واصلاح کے عنصر کو کبھی خارج نہیں ہونے دیتا۔

ان گزارشات کا ماحصل یہ ہے کہ نوع بشری کیلئے واحد اور منفرد راہ نجات راہ ایمان ہی ہے مسلمانوں کیلئے تو اس کی حیثیت رگ جان سے بھی زیادہ ہے اسی راہ پر چل کر وہ اپنے مقاصد کو حاصل کرسکتے ہیں اور اپنی امنگوں اور ارمانوں کو پورا کرسکتے ہیں۔ انہیں آخرت مطلوب ہو تو ایمان کی بدولت حاصل ہوسکتی ہے۔ دنیا مطلوب ہو تو اس کے حصول کا راستہ بھی یہی ہے دونوں کی طلب ہو تو ایمان اس کی بھی ضمانت دے سکتا ہے۔ جہاں تک ایمان کے ذریعے اخروی سعادت کے حصول کا تعلق ہے اس امر کی وضاحت ہم کسی دوسرے موقع کیلئے اٹھا رکھتے ہیں۔

لیکن جہاں تک دنیا اور اس کے آمال ومقاصد کی تکمیل کا تعلق ہے اور جہاں تک دنیا میں حصول سعادت کا تعلق ہے اس مطالعہ کے دوران ہم پر یہ حقیقت منکشف ہوچکی ہے کہ یہ سب

کچھ ایمان ہی کی بدولت ممکن ہے اس کے علاوہ اس کی کوئی سبیل نہیں۔

اگر ہم انفرادی زندگی کی سعادت وخوش بختی کے طالب ہیں تو وہ اطمینان قلب کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی اور طمانیت قلب کا حصول ایمان کے بغیر کسی طرح بھی ممکن نہیں۔ اگر ہمیں طہارت ونظافت مطلوب ہو تو معلوم ہے کہ یہ چیز استقامت کے بغیر میسر نہیں ہوتی اور استقامت ایمان کے بغیر نہیں ملتی۔ اگر ہم اجتماعی استحکام ووابستگی چاہتے ہیں تو اس استحکام کیلئے مواخات ضروری ہے اور مواخات کیلئے ایمان ناگزیر ہے۔ اگر دشمن پر غلبہ واستیلاء اور فتح ونصرت ہمارا مقصود ہو تو نصرت بہادری سے، بہادری قربانی سے اور قربانی ایمان سے پیدا ہوتی ہے اگر ہمیں اقتصادی خوشحالی درکار ہے تو خوش حالی کوشش پیداوار کے بغیر اور پیداوار اخلاق کے بغیر اور اخلاق ایمان کے بغیر محض حکایتِ تشنہ وسراب ہے۔ اگر ہمیں صنعتی اور ضیعیاتی ترقی مطلوب ہے تو ترقی اخلاص کے بغیر اخلاص متعین مقصد کے بغیر، اور زندگی کے کسی متعین مقصد کا ایمان کے بغیر تصور نہیں کیا جاسکتا۔ اگر ہم اپنی زندگی کی اصلاح کرنا چاہتے ہیں تو اصلاح تزکیۂ نفس کے بغیر، تزکیۂ نفس عزم صمیم کے بغیر اور عزم صمیم ایمان کے بغیر ممکن نہیں۔

ایمان ہی قوت اخلاق اور اخلاق قوت ہے یہی روح حیات اور حیات روح ہے۔ سرّ عالم اور عالم اسرار ہے، جمال دنیا اور دنیائے جمال، نور راہ اور راہ نور ایمان ہی ہے۔ ایمان مسافر کیلئے شگفتہ وشاداب وادی، ناخدا کیلئے روشن ستارہ، حیران وپریشان انسان کا رہنما، کارگاہ حیات میں جدوجہد کرنے والے کیلئے موثر ہتھیار، غریب الدیار کا رفیق اور وحشت زدہ کا انیس ہے ایمان قوی اور زور آور کیلئے لگام اور ضعیف وناتواں کیلئے سرمایہ قوت ہے۔

ایمان جرأت وشجاعت پیدا کرنے والا، حیرت انگیز انقلاب برپا کرنے والا، بند دروازوں کو کھولنے والا اور ہر چہار جانب رہنمائی کرنے والا روشن مینار ہے۔

ایمان...... بجائے خود ایک کلمہ ہے لیکن حیات انسانی کیلئے شاہ رگ، فرد کے لئے اطمینانِ قلب کا ایک سہارا اور معاشرے کیلئے ایک مضبوط بنیاد اور اساس ہے تاکہ اس میں سکون وقرار پیدا ہو، ضبط ونظم پیدا ہو اور انسان بہتر اور شادکام زندگی گزارنے کے قابل ہوسکے۔

اور ایمان سے ہماری مراد دین اسلام کا پیش کردہ ایمان ہے قرآن وسنت کا ایمان اور صحابہ

تابعین کا ایمان جو عرفان الٰہی، حسن نیت واعتقاد اور عمل صالح سے عبارت ہے وہ عقلی ایمان نہیں جو متکلمین کے ہاں ملتا ہے نہ وہ روحانی ایمان جو اہل تصوف کا خاصہ اور نہ وہ خشک ظاہریت پہ مبنی ایمان جو جمود پرست فقہاء کے ہاں پایا جاتا ہے۔

ہمارا مطلوبہ ایمان محض ایک شعار اور دعوت ہی نہیں بلکہ وہ ایک مکمل اسلوب حیات ہے فرد کیلئے بھی اور قوم کیلئے بھی نہایت تیز روشنی ہے جو فرد کی دنیائے فکر وارادہ کو منور کرتی ہے اور جب اس کی شعاعیں معاشرہ پر پڑتی ہیں تو اس کی رگوں میں خون زندگی دوڑنے لگتا ہے اس کے رگ وپے میں امن وعافیت سرایت کرتی چلی جاتی ہے وہ مریض ہوتا ہے اور دوائے ایمان اسے شفایاب کردیتی ہے بلکہ وہ مرچکا ہوتا ہے۔ اور اکسیر ایمان اسے حیات نوبخش دیتی ہے۔ سچ ہے کہ ایمان رموز الٰہی کا رازدان ہوتا ہے وہ جب کسی چیز کو کہتا ہے ہوجا تو وہ وجود میں آجاتی ہے۔

حقیقی ایمان پوری زندگی پر اپنے نقوش واثرات مرتب کرتا ہے اور اسے صبغۃ اللہ میں رنگ دیتا ہے انسان کے افکار ونظریات اس کے جذبات واطوار سب اطاعت الٰہی اور بندگی رب کا نقشہ پیش کرتے ہیں۔ زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہوتا جس پر یہ رنگ گہرا نہ ہو۔

''صبغة الله ومن احسن من الله صبغةً'' ...... وہ قوم جو ایمان سے منور زندگی بسر کرنا چاہتی ہے اسے اپنے جملہ اصول ومناہج تقاضائے ایمان کے مطابق بدلنا ہوں گے اور ہر اس چیز سے دستکش ہونا پڑے گا جو نور ایمان کا راستہ روکنے والی ہو اگر کوئی قوم یہ قربانی نہیں دیتی مگر اسلام وایمان کا دعویٰ کرتی چلی جاتی ہے تو اس کے اس دعویٰ کی کوئی حیثیت نہیں یہ دعویٰ بلا دلیل ہے۔

اے اللہ امت مسلمہ کی صراط ایمان کی طرف رہنمائی فرما:

صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلاَ الضَّآلِّیْن. آمین. اِلٰهَالحق آمین.

*****

حضرت سلمان فارسیؓ کو آپ ﷺ نے ترغیب دی تھی کہ یہ دعاء رات اور دن میں پڑھ لیا کرو۔

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْأَلُکَ صِحَّةً فِیْ اِیْمَانٍ وَاِیْمَاناً فِیْ حُسْنِ خُلْقٍ وَنَجَاحاً یَتْبَعُهٗ فَلَاحٌ وَرَحْمَةٌ مِنْکَ وَرِضْوَانًا

اے اللہ ہم آپ سے سوال کرتے ہیں صحیح ایمان کا اور ایمان کے ساتھ حسن سلوک کا اور ایسے نجاح کا جس کے بعد کامیابی ہو اور آپ کی جانب سے رحمت اور رضامندی کا۔ (حاکم: ۱/۵۲۳)

اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِکَ مِنْ عِلْمٍ لَا یَنْفَعُ وَمِنْ قَلْبٍ لَا یَخْشَعُ وَمِنْ نَفْسٍ لَا تَشْبَعُ وَمِنْ دَعْوَةٍ لَا یُسْتَجَابُ لَهَا

اے اللہ میں پناہ مانگتا ہوں غیر نافع علم سے، نہ ڈرنے والے قلب سے، نہ سیراب ہونے والے نفس سے، نہ قبول ہونے والی دعاء سے۔

حضرت ام معبدؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ یہ دعاء فرماتے تھے:

اَللّٰھُمَّ طَھِّرْ قَلْبِیْ مِنَ النِّفَاقِ وَعَمَلِی مِنَ الرِّیَاءِ وَلِسَانِیْ مِنَ الْکِذْبِ وَعَیْنِیْ مِنَ الْخِیَانَۃِ فَاِنَّکَ تَعْلَمُ خَائِنَۃَ الْاَعْیُنِ وَمَاتُخْفِی الصُّدُوْرُ

(مشکوٰۃ:۲۲۰،بیہقی)

اے اللہ میرے دل کو نفاق سے، عمل کو ریاء سے، زبان کو جھوٹ سے، نگاہ کو خیانت (بدنگاہی) سے محفوظ فرما، یقیناً آپ نگاہوں کی خیانت سے اور سینے میں ہے خوب واقف ہیں۔

حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ یہ دعاء فرماتے تھے:

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ التُّقیٰ وَالْھُدیٰ وَالْعِفَافَ وَالْغِنیٰ (مسلم،ترمذی،ابن ماجہ، مشکوۃ:۲۱۸)

اے اللہ میں تجھ سے پرہیزگاری، ہدایت، عفت اور غنا طلب کرتا ہوں۔